نگری نگری پھرا مسافر

ابن انشا



نگری نگری پھرا مسافر

سفر نامہ

ابنِ انشا

۱۹۸۹

طبع اوّل جون ۱۹۸۹ء

لاہور اکیڈمی

۲۰۵ سرکلر روڈ

لاہور

پیش لفظ

اُردُو میں سفر نامہ کی ایک طویل روایت موجود ہے۔اسی طرح طنز و مزاح بھی ایک صدی سے لکھا جارہا ہے۔ دورِ حاضر میں ایک طرف سفر نامے بڑی تعداد میں لکھے جا رہے ہیں تو دوسری طرف طنز و مزاح کی تصانیف خاصی تعداد میں سامنے آرہی ہیں مگر ان موضوعات پر کتابوں کی اِس درجہ فراوانی کے باوجود اچھّے مصنّفین تعداد میں بہت کم ہیں۔ ابن انشاء کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے سفر نامے اور طنز و مزاح کو یکجا کر کے ان دونوں سے ایک نئی صنفِ ادب تشکیل دی ہے، جو بظاہر سفر نامہ

ہے۔ لیکن اس کی ہر ہر سطر میں بے ساختہ مزاح کے ایسے دل پذیر نمونے ملتے ہیں جو اچھّے سے اچھّے مزاح نگار کے لیے بھی باعثِ رشک ہو سکتے ہیں۔ انشا جی اِس نکتے سے آگاہ تھے کہ اُردُو کے معروف سفر نامے بہت سی دلکشی کھو چکے ہیں۔ ذرائع ابلاغ کی وجہ سے مختلف ممالک کے متعلّق لوگوں کی معلومات میں بہت کُچھ اضافہ ہو چکا ہے۔ مختلف ممالک کے جغرافیے، تاریخ، اہم مقامات اور طرزِ زندگی سے کتابوں اور اخباروں ہی کے ذریعے نہیں بلکہ فلموں کی مدد سے بھی لوگوں کو بہت سی معلومات حاصل ہو چکی ہیں۔ اِس لیے جن سفر ناموں میں محض تاریخ و جغرافیہ ملتا ہے ان سے قارئین کو زیادہ دلچسپی نہیں رہی۔ یہی سبب ہے کہ ابنِ انشاء نے محض معلومات سے اپنے سفر ناموں کو گراں بار کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ وہ جہاں بھی گئے اور وہاں کے افراد اور ماحول سے انہوں نے جو کُچھ اخذ کیا اِسے دِل نشیں مگر ہلکے پھلکے انداز میں پیش کر دیا۔ اِس طرح ان کے سفر ناموں میں دلچسپی کا ایسا عنصر شامل ہوا جو ان سے پہلے کے کسی سفر نامہ نگار کو حاصل نہیں ہو سکا۔

زیرِ نظر سفر نامہ جس کا زیادہ حصّہ جاپان جیسے ترقّی یافتہ صنعتی ملک کے بارے میں ہے اُن کے دیگر سفر ناموں سے کسی طرح بھی کم تر مقام کا حامل نہیں ہے۔ وہ ٹوکیو کا ذکر کریں یا کیوٹو کا۔ کسی ہوٹل میں فروکش ہوں، یا کسی دفتر میں جائیں، ان کی نظر

ہر جگہ دلچسپی کے پہلو فوراً تلاش کر لیتی ہے۔ اور پھر انہیں ایسا اندازِ بیان بھی سہولت سے میسّر آ جاتا ہے جس سے واقعات اور زیادہ خوشگوار بن جاتے ہیں۔ ہمارے جدید مزاحیہ ادب میں ایک طرف شفیق الرحمان کی تحریریں ہیں جو وفور مزاح کے باوجود ایک خاص ذہنی سطح کے قاری کو اچھّی لگتی ہیں، جبکہ دوسری طرف مشتاق احمد یوسفی کی تصانیف ہیں۔ جن کے مزاج سے لُطف اندوز ہونے کے لیے ایک خاص پختگی اور وسعتِ مطالعہ کی ضرورت ہے۔ ابن انشاء ان کے وسط میں ہیں۔ اِن کے ہاں جملوں کی آمد اور بے ساختگی ہر سطح اور ہر ذہن کے قاری کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے، اس لیے یہ بات پورے یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ ابن انشا کے خندہ آور سفر نامے اپنے منفرد انداز اور جدّتِ اسلوب کے باعث ہر ذہنی سطح کے قارئین میں اتنے مقبول ہیں کہ کوئی دوسرا سفر نامہ نویس یا مزاح نگار ان کا حریف نہیں ہو سکا۔

ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا

میں منجی کتھّے ڈاہواں

ٹوکیو میں ہمارے لئے سب سے پہلا مسئلہ ہوتا ہے منجی کتھّے ڈاہواں۔ یہ شہر مہنگا تو ہمیشہ سے تھا، لیکن اب اور مہنگا ہو گیا ہے۔ لوگ کہتے ہیں ہوٹلوں اور غُسل خانوں کے بارے میں کیوں لکھتے ہو۔ کیوں نہ لکھیں جس تن لاگے سو تن جانے۔ اب یہی دیکھئے۔ ہمارے لئے ہوٹل مارونوچی مقرّر ہوا۔ پہلے تو اِس کا نام یاد رکھنے میں تکلیف ہوئی۔ آخر اُردُو کا ایک محاورہ یاد آیا۔ماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ۔ اِس کی نسبت سے مارو یاد آتا تھا اور نوچی ہم اِس کے بعد خُود لگا لیتے تھے۔ لیکن یہ تکالیف کے سِلسِلے کی پہلی

کڑی تھی۔ کمرے میں گئے تو سخت گرمی۔ پہلی رات تو ہم نے جُوں تُوں گزار دی۔ یہ سمجھ کر کہ ہمارا ان کا ٹھنڈک کا تصوّر ایک دوسرے سے مختلف ہو گا۔ دوسری رات شکایت کی۔

مینجر نے کہا۔ ”جناب جب سے انرجی کا بحران آیا ہے ہم نے بجلی خرچ کرنی بند کر دی ہے۔ ہمیں حکومت کی طرف سے ہدایت ہے کہ گیارہ بجے ائر کنڈیشنر بند کر دیا کرو۔“

ہم نے کہا۔ ”کل تو خیر ہم آئے گیارہ بجے تھے لیکن اِس وقت تو شام کے آٹھ بجے ہیں۔ آپ نے ابھی سے بند کر دیا ہے۔“

فرمایا۔ ”یہ صحیح ہے لیکن گیارہ بجے ہم مزید بند کر دیتے ہیں۔“ اس پر ہمیں وہ رئیس یاد آئے جنہوں نے سائیس سے کہا تھا کہ گھوڑے پر زین ڈال دو۔ اس نے کہا حضور۔ وہ تو پہلے ہی ڈال دی ہے۔ آقا نے ازراہِ سیر چشمی فرمایا۔ اور ڈال دو۔

کمرے اس ہوٹل کے لحد کے سائے سے کُچھ ہی بڑے ہوں گے اس کے پلنگ پر آدمی کروٹ تو بدل سکتا ہے اور کوئی کام نہیں کر سکتا۔ کروٹ بدلنے کی گنجائش بھی اس لئے رکھی ہے کہ ائیر کنڈیشنر بند ہونے کے بعد آدمی یہ بھی نہ کرے تو کیا



منجی کتھے ڈاہواں

کرے۔ آٹھ نو منزل کا ہوٹل ہے یہ ٹوکیو کے بڑے ریلوے اسٹیشن کے نواح میں ہے۔ اِس میں بڑے ہوٹلوں کی سی کوئی خصوصیت نہیں ہے سوائے کرائے کے۔ اِس لحد نما کمرے کا یہ مبلغ دو سو روپے روزانہ لیتے ہیں۔ روزانہ کیا شبانہ کہیئے کیونکہ دِن کو ہم ہوٹل میں ہوتے ہی نہیں۔ اپنے کام پر باہر ہوتے ہیں۔ یاد رہے کہ اِس میں ناشتہ شامل نہیں ہے۔ اپنا مُلک بہت یاد آیا۔ ریلوے اسٹیشن کے سامنے سائبانوں تلے منجیاں یعنی چارپائیاں بچھّی ہوئی۔ بلکہ ایک دوسرے کے ساتھ اس

طرح جُڑی ہوئی کہ مسافر کو پھلانگ کر جانا پڑے۔ یہ سچ ہے کہ ملحقہ غُسل خانہ ہر چارپائی کے ساتھ نہیں ہوتا لیکن میں نئی روشنی کا کھڑاک ہے۔ ناحق کا ضمیمہ ہے۔ ہمارے ملک میں کوئی جگہ ایسی نہیں جس کے آس پاس نالی یا نالہ نہ پڑتا ہوں۔ یہ نہ ہو تو کوئی کھُلا کھیت یا پلاٹ یا سایہ دیوار ہوتا ہے۔ جب ذرا گردن جھکائی۔۔۔۔۔ کرایہ اس منجی کا چار آنے روز ہوتا ہے۔ اب مہنگائی اور مہنگائی الاؤنس ڈالنے کے بعد آٹھ آنے ہو گا۔ بارہ آنے ہو گا۔ جی تو ہمارا بھی چاہا تھا کہ ایک منجی یہیں سے اپنے ساتھ لے جائیں۔ ٹوکیو اسٹیشن کے سامنے کسی سائبان تلے ڈاہ لیں گے، بچھا لیں گے۔ کوئی پولیس کا پیادہ پوچھے گا تو چونّی اٹھنّی دے کر اُسے راضی کر لیں گے۔ لیکن ہوائی جہاز والوں میں تعاون کا جذبہ کم تھا۔ بولے جی نہیں چارپائی جہاز پہ بار کرنے کی اجازت نہیں۔

جہاں ایک رات کے منجی ڈاہنے کے یعنی چارپائی بچھانے کے دو سو روپے لیتے ہوں، وہاں اگر چائے کی پیالی کے، محض چائے کی پیالی کے چھ روپے لیں تو تعجّب نہ ہونا چاہیے۔ اب کہاں کہاں پرانی سراؤں اور اُن کی بھٹیارنوں کو یاد کیجیۓ جو دو پیسے میں روٹی دیتی تھیں اور دال مُفت۔ مسافر شام کو گھوڑے بیچ کر یا احاطے میں باندھ کر سوتا تھا اور صُبح شاداں و فرحاں اُٹھتا تھا۔ اگر بھٹیارن طرح دار ہو تو طرح داری بھی

مُفت ہوتی تھی۔ لگاوٹ کے پیسے الگ سے بل میں نہیں لگتے تھے۔ یہ نئے زمانے کے ہوٹل لوگوں کو ٹھہراتے کیا ہیں، اُن کا سر مُونڈتے ہیں۔ لیجئے مُونڈنے سے حجامت کے نرخ بھی یاد آئے جو ہمارے ہوٹل والوں نے اپنے کمرے میں آویزاں کر رکھے ہیں۔ بس پینتالیس روپے دیجئے اور بال کٹوا لیجئے۔ لیکن فقط سر کے بال۔ اگر داڑھی مُنڈوانا بھی مقصود ہے تو اُس کی اُجرت بھی واجبی ہے۔ کل ستائیس روپے۔ جانے اِن جاپانیوں کے منہ پر داڑھیاں آتی ہی نہیں ہیں یا اور کوئی بات ہے۔ ہر صُبح ستائیس روپے تو کوئی خرچ نہ کرتا ہو گا۔ ہم نے اپنے دوست امان اللہ سردار سے شکایت کی۔ بولے تمہارا ہوٹل سستا ہے۔ میں تو باون روپے دیتا ہوں بال کٹوانے کے۔ پھر کسی سے معلوم ہوا یہ تاریخی ہوٹل ہے۔ اِسی تاریخی ہوٹل میں جنرل میکارتھر کا ہیڈ کوارٹر ہوا کرتا تھا۔ یہاں تاریخی یادگاروں کو محفوظ رکھنے کا رواج ہے۔ چنانچہ لابی میں جو صوفے پڑے ہیں، کرسیاں ہیں سبھی میکارتھر کے زمانے کی باقیات ہیں۔ یہ سوچ کر کہ انہی اسپرنگوں والے بھوسڑوں پر میکارتھر وغیرہ بیٹھتے ہوں گے، بڑی خوشی ہوئی۔

ہم نے پچھلی بار لکھا تھا کہ جب سے انرجی کا کرائسس ہوا ہے تیل کا توڑا ہوا ہے، ٹوکیو وہ چکاچوند والا ٹوکیو نہیں رہا۔ گنزہ کے علاقے کی وہ جگمگاہٹ اب نہیں رہی جس کے

لیے دُنیا بھر میں مشہور ہے۔ یہی کیفیّت دمِ تحریر ہے۔ روشنیاں ہیں لیکن بقدرِ اشکِ بُلبُل۔ انتہا یہ ہے کہ ٹیلی وژن والے بہت ناخوش ہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ جو لوگ رات کو ساڑھے بارہ بجے کے بعد ٹیلی ویژن دیکھنا چاہیں وہ کیا کریں۔ اور پھر صُبح ۶ بجے سے پہلے شروع کرنے کی بھی ممانعت ہے۔ عرض دو گونہ عذاب است جانِ مجنوں را۔

ہاں ایک رات ہم نے نیو اوتانی ہوٹل میں بھی گزاری۔ یہ اس سے بڑا ہوٹل ہے بلکہ ٹوکیو کے ممتاز ترین ہوٹلوں میں ہے۔ یہاں چھوٹے سنگل کمرے کا حساب کوئی تین سو چالیس روپے کا تھا۔ یہ بہت اونچا ہے اور اس کی چوٹی پر دور یستوران ہیں۔ ہم نے سوچا آج شام ڈنز یہاں کھائیں۔ چار پیسے زیادہ سہی۔ ہم ہمیشہ کے شاہ خرچ اور فراخ دِل واقع ہوئے ہیں۔ ہمارے لئے کیا فرق پڑتا ہے۔ یہاں بیروں نے ہماری اِس طرح تعظیم و تکریم کی کہ خیال ہوا غازی الدّین حیدر کے اودھ میں آ گئے ہیں۔ پہلے تو بٹھا کر شراب کا پوچھا۔ اس کا ہم نے منع کیا تو مینو لے آئے اور پنسل نکال کر آرڈر کے مُنتظر ہوئے۔ ہم نے فہرست میں سے ایک پلیٹ پسند کی۔ آرڈر دینے کو تھے کہ سامنے قیمت پر نظر پڑی۔ جاپان میں یہ بڑی اچھّی بات ہے کہ قیمت ہر چھوٹی بڑی چیز پر لکھی رہتی ہے تا کہ مسافر کو بعد ازاں حوالات نہ بھیجنا پڑے۔ اس کا سامان نہ

قرق کرنا پڑے۔ قیمت محض ایک پلیٹ کی ۶۳۸۰ ین یعنی کوئی سوا دو سو روپے تھی۔ پہلے تو سوچا کھالیں۔ اس کے ساتھ چائے کافی وغیرہ ملا کر چار پانچ سو روپے ہو جائیں گے۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہو گا کہ حوالات بھیجیں گے۔ سُنا ہے یہاں کے حوالات آرام دہ ہیں۔ ہمارے پاکستان والے گھر سے اچھّے ہیں۔ اگر سامان قرق کیا تو بھی مُضائقہ نہیں۔ اس کی مالیت بہر حال چار یا پانچ سو روپے سے کم ہے۔ لیکن پھر کُچھ سوچ کر باز آئے اور بیرے سے یہ کہہ کر ہم ایک چیز بھول آئے ہیں، ابھی آتے ہیں، ہماری جگہ ریزرو رکھنا، نیچے کافی ہاؤس میں چلے آئے۔ یعنی آنے والی تھاں۔ ہم نے پچھتّر روپے میں اچھّا خاصا پیٹ بھر لیا۔ بلکہ مونچھوں پہ تاؤ بھی دیا۔ ٹیکسی کے کرائے بھی کُچھ بڑھ گئے ہیں۔ پہلے چھ روپے سے میٹر شروع ہوتا تھا۔ اب ۲۲۰ ین یعنی ساڑھے سات روپے دیجیے۔ لیکن اچھی بات یہ ہے کہ جاپان میں بخشیش یا ٹِپ کا سِلسِلہ نہیں ہے۔ ورنہ جرمنی اور انگلستان بالخصوص امریکہ کا ٹیکسی ڈرائیور تو آپ کو گریبان سے پکڑے گا اگر آپ اُس کی توقّع سے کم ٹِپ دیں گے۔ بلکہ کرایہ چھوڑ دے گا ٹِپ نہیں چھوڑے گا۔ بیرونی سیّاحوں نے ٹِپ دے کر جاپانیوں کی عادت خراب کرنے کی بہت کوشش کی لیکن کامیاب نہیں ہوئے۔ سیاحتی کتابچوں تک میں لکھا ہے کہ خُدارا کسی کو ٹِپ دے کر ہماری اس بخشیش سے

مُبرّا جنّت کو خراب کرنے کی کوشش نہ کیجئے۔

ٹوبہ سے ٹوبہ تک

ٹوبہ ٹیک سنگھ تو مشہور جگہ ہے جسے منٹو مرحوم نے اپنے ایک افسانے سے مشہور تر کر دیا ہے لیکن معلوم ہوا کہ دُنیا میں ٹوبے اور بھی ہیں۔ بہاولپور کے علاقے میں تو قدم قدم پر ٹوبہ ہے۔ قائم ٹوبہ، مراد ٹوبہ، محراب ٹوبہ، جمالو والا ٹوبہ، کھاریوالہ ٹوبہ، گُل والا ٹوبہ، عین والا ٹوبہ، متوالی والا ٹوبہ، دادن والا ٹوبہ، یہ والا ٹوبہ اور وہ والا ٹوبہ۔ لیکن جاپان میں ہم ہفتے کی شام شاداں و فرحاں جس اسٹیشن پر جا کر اُترے اُس کا نام بھی ٹوبہ تھا۔

پنجابی میں ٹوبہ کا مطلب جوہڑ ہے، پانی کا تال۔ ہم نے اپنے جاپانی دوستوں سے کہا دیکھئے پنجابی اور جاپانی میں کتنی چیزیں مُشترک ہیں۔ اِس لفظ ٹوبہ کو لیجئے۔ ہم تھوڑی اور تحقیق کریں جس کے لیے آپ کی حکومت کو ہمیں وظیفہ دے کر بلانا چاہیے تو یہ ثابت کرنا مُشکل نہیں کہ کسی زمانے میں پنجاب اور جاپان ایک ہی تھے یا کم از کم اِن کی سرحدیں ملی ہوئی تھیں۔ ناموں میں دیکھئے۔ پ ن ج ا دونوں میں مُشترک ہیں۔ بس ایک حرف اِدھر سے اُدھر ہو گیا ہے۔ خصوصیات بھی ملتی جُلتی ہیں۔ آپ لوگوں نے باہر کی مصنوعات کی نقلیں بناتے بناتے اتنی ترقّی کی۔ ہم بھی ایسا ہی کر رہے ہیں۔ باہر کوئی فلم بنتی ہے تو دوسرے دِن ویسا ہی بلکہ اس سے اچھّا چربہ بنا لیتے ہیں۔ آپ لوگ ریڈیو بناتے ہیں۔ ہم ریڈیو سُنتے ہیں۔ آپ لوگ کاریں بناتے ہیں ہم ان پر چڑھتے ہیں۔ آپ ٹیپ ریکارڈ بناتے ہیں۔ ہم اُن پر گانے سُنتے ہیں۔ آپ جن چیزوں کو برآمد کرتے ہیں انہی کو ہم درآمد کرتے ہیں۔ غرضیکہ کُچھ لمبا چوڑا فرق نہیں آپ میں اور ہم میں۔۔۔

ہماری تقریر لمبی ہو رہی تھی۔ ہمارے جاپانی دوست نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا۔
”تو گویا تمہارے ہاں بھی کوئی ٹوبہ ہے۔۔۔۔“

ہم نے کہا:

”ایک تھوڑی ہے۔ قدم قدم پر ٹوبہ ہے۔ صرف بہاولپور کے علاقے میں تین سو تینتالیس ٹوبے میں ایسی کوئی مجبوری نہیں کہ ڈوبنے جاؤں تو دریا ملے پایاب مُجھے۔“

بولے۔ ”تمہارے ہاں ٹوبہ کا کیا مطلب ہے۔“

ہم نے کہا: ”ٹوبہ کا مطلب ہے جوہڑ۔ پانی کا جوہڑ۔ جیسے یہاں ہم دیکھ رہے ہیں۔ یہ سامنے پانی جو ہے ٹوبہ ہی ہے۔“

کہنے لگے۔ ”یہ جوہڑ تو نہیں ہے۔ یہ تو بحر الکاہل ہے۔“

واقعی ہم سوچ رہے تھے کہ یہ ٹوبہ اتنا بڑا کیوں ہے۔ اِس کا دوسرا کنارہ کیوں نظر نہیں آتا۔ ہم نے کہا۔ ”اصل تو دونوں کی ایک ہی ہے۔ فرق چھوٹے اور بڑے کا ہے۔ بحر الکاہل بھی تو اللہ میاں کا ٹوبہ ہی ہے۔“

فرمانے لگے۔ ”جاپانی زبان میں اس کا مطلب ہے، پرندے کا پَر۔“

ہم نے کہا۔ ”یہ نہیں ہو سکتا۔ کوئی باہوش آدمی بحر الکاہل کے اِس ساحلی شہر کا اِس قسم کا بے محل نام نہیں رکھ سکتا۔ ضرور پرانی جاپانی میں ٹوبہ کا مطلب جوہڑ ہو گا۔ جوہڑ کے کنارے مُرغابیاں اور دوسرے پرندے آ آ کر بیٹھنے لگے اور پھڑ پھڑانے

لگے تو کسی لال بجھکڑ نے سمجھا کہ پرندے کے پَر کو ٹوبہ کہتے ہیں۔ یہ سارا معاملہ صاف ہو سکتا ہے اگر تھوڑی سی ریسرچ ہم پنجاب اور جاپان کے مشترک ورثوں پر کریں اور اس کے لئے حکومت جاپان میں وظیفہ دے کر۔۔۔۔

خیر وہ کُچھ بھی تھا۔ تھی عجیب رومان پرور جگہ اور ہمارا ہوٹل ٹوبہ انٹرنیشنل عین سمندر کے تٹ پر تھا۔ سمندر سے کُچھ خلیجیں اندر چلی گئی ہیں۔ ان میں سے کُچھ جہاز کہ ہمارے سامنے لنگر انداز ہو رہے تھے۔ اِسی نواح میں وہ جزیرے ہیں جہاں موتی ملتے ہیں۔ جاپان کے مشہور موتی۔ مکی موٹو کے موتی۔ وہ سامنے کا جزیرہ کہلاتا ہی، پرل آئی لینڈ ہے یعنی جزیرۂ مروارید۔ یہاں ہم نے موتیوں کو چمکانے کا کارخانہ بھی دیکھا۔ بالٹیوں اور تغاروں میں موتی بھرے تھے۔ جی چاہا ہم بھی جھولی بھر لیں پھر باز آ گئے۔ ایک تو اِس لئے کہ ہماری طبیعت میں فقر اور درویشی ہے اور دوسرے اس لئے کہ اِن کے پہرے دار دیکھ رہے تھے۔

مڈ سمر نائٹ، وسط گرما کی آدھی رات تک اِس پلیٹ فارم پر ہم نے سبھا جمائی جو پانی کے اوپر چھایا ہوا ہے۔ ملک ملک کے لوگ، آدھے صاحب، آدھی بیبیاں، پھر لوگ ایک ایک کر کے اپنے کمروں میں چلے گئے۔ پُر تکلّف ہوٹل ہے۔ مارونوچی کی طرح چمار چودس نہیں ہے۔ سرِ شام اس کے نیچے کے دالان میں جاپانی طرز کی دعوت کا

انتظام تھا۔ ہمارے دوست اور میزبان ایتو صاحب مزے کے آدمی ہیں۔ ایشین کلچرل سنٹر برائے یونیسکو کے ڈائریکٹر جنرل ہمہ وقت چونچال کھانا نوساکی اوکی، ڈنر تھا۔ سامنے کیتلی چڑھا دیتے ہیں۔ اِدھر اُدھر گوشت سبزیاں لاکر رکھ دیتے ہیں کہ تلّو اور کچّے انڈے میں ڈبو کر کھاؤ۔ کھاؤ اور پیو۔ سچ یہ ہے کہ جس طرح کابو کی تھیٹر ہمیں خوش نہیں آتا۔ یہ کھانا بھی ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔ کچّی پکّی سبزیاں اور ایک دو قتلے گوشت کے یہ اطمینان کر کے کہ بیف ہی میں نوشِ جان کئے اور پیٹ کی باقی خالی جگہ کو کوکا کولا سے پُر کیا۔ اب اعلان ہوا کہ ایک ڈرامہ دِکھایا جائے گا جو ابھی ابھی تیّار کیا گیا ہے جس کی ریہرسل بھی نہیں کی گئی۔ ہر چند کہ ہم اپنے ہاں ٹیلیویژن پر بھی ایسے ڈرامے دیکھ چکے ہیں جِن کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ابھی ابھی لکھے گئے ہیں۔ ریہرسل نہیں ہوئی تاہم سوچا دیکھیں یہ جاپانی لوگ کیسا ڈرامہ کرتے ہیں۔

پس ہمارے درمیان سے کُچھ لوگ کھاتے کھاتے اُٹھے، اور ایک طرف جا کر کھُسر پھُسر کرنے لگے۔ ڈرامے کا نام تھا۔ پکچر وائف۔ کہانی سے ہم آشنا تھے۔ ایک تھا کسان۔ تنہا، ملول، غریب، شاعر مزاج ہماری طرح کا۔ ایک روز اپنے آنگن میں اداس بیٹھا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ دروازہ کھولا۔ ایک حسینہ تھی۔ ماہ جمال۔

کیا بتلائیں، کس کی شکل کی۔ اس نے آتے ہی دُعا سلام کُچھ نہ کیا۔ کہا تو یہ کہا اے میاں کسان مُجھ سے شادی کرو گے؟ کسان کے ہاتھ اسد کی طرح خوشی سے پھُول گئے۔ بولا ہاں۔ اِس موقع پر پردہ گر گیا اور ہم کو رشک آنے لگا کہ یہ اچھا ہے۔ یہاں بغیر آہیں بھرے اور فریاد کیے اور ہجر کی صعوبتیں کھینچے اور رقیبوں سے زور آزمائی کئے دِل کی مُراد ایسی آسانی سے مل جاتی ہے۔ ہم جاپان کی شہریت لینے کی سوچ رہے تھے کہ پردہ اُٹھ گیا۔ اب پھر کسان صاحب تھے۔ ذرا سا ہل چلاتے تھے۔ گھر بھاگتے تھے۔ بیوی کی صورت دیکھنے۔ مرلہ بھر ہل چلاتے ہوئے وہ کوئی بیس بار آئے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم ہوتے تو یہی کرتے۔ وہ لڑکی مس فیوجی تھی بھی خوب صورت۔ وہیں یونیسکو کے سیکریٹریٹ میں کام کرتی ہے۔ جاپانی لباس میں شرما کر اور خوب صورت ہو گئی تھی۔ آخر اس بی بی نے کہا۔ اے میاں۔ یُوں تو کام نہیں چلے گا۔ بھُوکے مرو گے۔ یہ بار بار مجھے دیکھنے آنا کیا معنی۔ اپنی تصویر تمہیں بنا دیتی ہوں، اُسے دیکھتے رہا کرو۔ چنانچہ اُس بی بی نے کسی مصوّر سے اپنی تصویر بنوا کر اُسے دے دی۔ اُس مصوّر نے بھی ریہرسل نہ کی تھی۔ کہیں سے بنی بنائی تصویر کسی اور بی بی کی ہوٹل کے برآمدے سے اُٹھا لایا تھا، لیکن خیر یہ ڈراما تھا اور ڈرامے میں تصوّر شرط ہوتا ہے۔ اب اس عزیز کا ہاتھ تو ہل کی ہتھّی پر ہوتا تھا اور نظریں تصویر پر۔

قضارا آندھی آئی اور تصویر اُس کے ہاتھ سے اُڑ گئی اور ایک رئیس کی جھولی میں جا گری اور وہ اُسے دیکھتے ہی ہزار جان سے عاشق ہو گیا۔ اور اس پر خواب و خور حرام ہو گیا اور اس نے اپنے پیادے دوڑائے کہ اِس تصویر والی لڑکی اِس ناظورۂ دِلفریب کو لاؤ تو بچتا ہوں ورنہ ابھی چھُری اپنے پیٹ میں گھونپتا ہوں۔۔۔۔

خیر کہانی ایسی ہی تھی۔ مشرقی کہانیوں ایسی تھوڑی سی مُصیبت اور ہفت خواں وغیرہ آخر میں حق کی فتح اور بقیہ عُمر ہنسی خوشی بسر کرنے پر ختم ہونے والی۔ خاص بات اِس ڈرامے میں یہ تھی کہ پردہ کوئی پینتیس بار ِگرا۔ لوگ ایک ہی فقرہ یاد کر پاتے تھے۔ پردہ گرا کر اسکرپٹ سے آگے کا فقرہ معلوم کرتے تھے۔ کئی بار تو ساز و سامان کی ضرورت پڑی مثلاً دو پیالوں کی تو ہیرو بے چارا بھاگا بھاگا ہمارے پاس آیا۔ ہماری میز پر سے دو پیالے اُٹھا کر لے گیا۔ ایک بار اُس رئیس خانہ خراب کی مُونچھیں ِگر گئیں۔ کئی بار وہ محبوبہ جاں نواز مس فیوجی اپنے مکالمے بھولیں اور اُن کے مخاطب کو اُنہیں بتانا پڑا کہ تُم یہ کہو، میں یہ جواب دوں گا۔ غرضیکہ اچھّا پُر لطف ڈراما تھا۔ Instant ڈراما۔

یہ جگہ جس کے نواح میں ایسا شیما کے جنگلات واقع ہیں جِن کو نیچرل پارک کہتے ہیں۔ جاپان کے جنوب مشرقی ساحل کے پاس واقع ہے۔ ٹوکیو سے ہکاری میں نگویا



جب ذرا گردن اٹھائی

جایئے۔ دو گھنٹے کی راہ ہے، وہاں سے دوسری ریلوے لائن لے کر ٹوبہ۔ اس میں دو گھنٹے مزید۔ ہکاری کو بُلٹ ٹرین بھی کہتے ہیں۔ یعنی گولی ٹرین۔ کیونکہ یہ دُنیا کی سب سے تیز رفتار گاڑی مانی جاتی ہے۔ رفتار اس کی ہے ۱۳۰ میل فی گھنٹہ۔ ہم نے کبھی گولی چلائی، نہ کبھی گولی کھائی۔ اِس گاڑی کی رفتار سے گولی کی رفتار کا اندازہ بھی ہوا۔ پاکستان میں یہ ٹرین چلے تو کراچی سے لاہور کی مسافت چھ گھنٹے کی رہ جائے۔

ہم نے ایک بار پہلے بھی اِس سے سفر کیا ہے جب کشفی صاحب سے ملنے اوساکا گئے

تھے۔ کیا صاف ستھری ٹرین ہے اور جب ساتھی ہوں تو ہنستے کھیلتے گاتے بجائے منزلیں طے کرتے جاتے ہیں۔ جاپان کی خوب صورتی کے کیا کہنے کہ اس کی صورتوں میں بھی ہے۔ اس کے مناظر میں بھی ہے۔ اس کے اطوار میں بھی ہے۔ لیکن اب تک جتنے قریے قصبے دیکھے ٹوبہ اور اس کے نواحات ان سب سے بڑھ کر پُر بہار اور دِل نشیں پائے ع

جی یہ کہتا تھا یہاں سے نہ اٹھاؤ ڈیرے

اک ذرا نام اِس مقام کا غیر شاعرانہ ہے اس میں ٹ آتی ہے، ورنہ اس سے منسوب کر کے اور نہیں تو ایک آدھ دل گُداز غزل تو ضرور لکھ چکے ہوتے۔ ٹوبہ کو ہم طوبیٰ البتہ بنا سکتے ہیں۔ لیکن یہ خیال اس وقت لکھتے ہوئے آیا ہے، اس وقت آیا ہوتا۔



خالی ڈبّہ ہاتھ سے اونچا کیا ہی تھا کہ سنتری نے دیکھ لیا

ہم کو وطنِ عزیز بہت یاد آیا

جاپان میں اب کے ہمیں وطنِ عزیز بہت یاد آیا۔ ایک روز تو بہت ہی یاد آیا۔ ہائے یہاں کی آزادی کہ کوئی روکنے والا نہیں، کوئی ٹوکنے والا نہیں، سگریٹ کا ٹکڑا تو خیر معمولی چیز ہے۔ آپ کسی بھی دفتر کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے کسی بھی سینما کے غُسل خانے میں ہاتھ دھوتے ہوئے دیوار پر پان کی پیک پھینک سکتے ہیں۔ دوسرے مُلکوں میں یہ ہے کہ راستہ چلتے میں کوئی ضروری حاجت تنگ کرے تو غُسل خانہ ڈھونڈنا پڑتا ہے۔ ''جنٹلمین'' کا نشان دیکھنا پڑتا ہے۔ یہاں ذرا اِک گردن جھکائی اور

کسی بھی دیوار کے سائے میں بیٹھ گئے۔ ناک ہر شخص کی اپنی ذمّہ داری ہے۔ آپ اپنی ناک پر رومال رکھ لیجئے۔ پاس سے گزرنے والا اپنی ناک پر رکھ لے گا۔ خواہ مخواہ لوگ ایک ذاتی مسئلے کو معاشرتی مسئلہ بنالیتے ہیں دوسرے مُلکوں میں۔

ایک روز ہمیں پیاس لگی۔ لگتی تو روز ہی تھی لیکن یہ واقعہ ایک ہی روز کا ہے۔ ہم امان اللہ سردار کے ساتھ اُن کی کار میں جارہے تھے۔ ہم نے کہا کُچھ پینے کو جی چاہتا ہے۔ کوکا کولا وغیرہ۔ سامنے ہی مشین تھی۔ اِس میں سِکّے ڈالے اور ایک ڈبّہ کوکا کولا کا امان اللہ سردار نے لیا، ایک ہم نے پیا۔ پی تو لیا، اب سوال یہ تھا کہ خالی ڈبّہ کہاں پھینکے۔ اپنا مُلک ہوتا تو کوئی تردّد کی بات نہ تھی۔ گھُما کے بیچ سڑک کے پھینک سکتے تھے اور اُس کے لڑھکنے کا تماشہ دیکھ سکتے تھے۔ ورنہ فُٹ پاتھ پہ ڈال دیتے۔ جاپان میں ایسی آسانیاں نہیں۔ سڑکوں اور فُٹ پاتھوں پہ گھاس کا تنکا نہیں ہوتا۔ کاغذ کا پُرزہ تک نہیں ہوتا۔ ناچار خالی ڈبّے کار ہی میں رکھ لئے۔ ایک ویران سی جگہ پر کھمبے کے ساتھ لگانے کو تھے کہ پاس کے ہوٹل سے ایک چوکیدار نکل آیا۔ اُس نے ہمیں غور سے تاڑا۔ ہم پھر کار میں آکر بیٹھ گئے۔ ایک پارک کی باڑ کے ساتھ پھینکنے کے لئے ہاتھ اُونچا کیا ہی تھا کہ ایک سنتری نے سیٹی بجادی۔ ایک گٹر نظر آیا۔ اُس کا مُنہ کھُلا ہوتا تو اُس میں ڈال دیتے لیکن وہاں گٹروں کے ڈھکن کوئی نہیں چُراتا اور

ہمارا اِس کام کے لیے ڈھکن اٹھانا ہمیں اپنی شان کے خلاف نظر آیا۔ اس کے چند روز بعد پھر ہم ان کی کار میں بیٹھے۔ کوکا کولا کے دونوں ڈبّے اُن کی ڈگی میں پڑے تھے۔ اب تک پڑے ہوں گے۔ آپ ہی کہیئے ایسے میں وطن یاد آتا کہ نہ آتا۔ ہماری تو آنکھوں میں آنسو تک بھر آئے تھے۔

ٹریفک بہت ہے لیکن ٹریفک کے حادثے اتنے نہیں ہیں۔ دو گاڑیاں لڑ جائیں تو فریقین پہلے تو اُتر کر ایک دوسرے کو جھک کر تعظیم دیتے ہیں۔ فوراً ایک دوسرے کے شجرۂ نسب میں نقص نکالنے نہیں بیٹھ جاتے۔ نہ ایک دوسرے کی گردن میں ہاتھ دیتے ہیں۔ نہ مجمع لگتا ہے۔ دونوں ایک دوسرے کی گاڑی کا جائزہ لیتے ہیں اور ستّر اسّی فیصدی صورتوں میں وہیں تصفیہ ہو جاتا ہے۔ قصوروار آدمی یا تو زرِ نقد دے دیتا ہے یا اپنے نام کا کارڈ کہ مرمّت کرالو اور بِل مُجھے بھیج دو۔ یہ لوگ اپنی ہر چیز پر نازاں ہیں کہ اتنے بڑے سو کروڑ کے شہر ٹوکیو میں کبھی بجلی فیل نہیں ہوتی۔ کبھی پانی بند نہیں ہوتا۔ کبھی ٹریفک سگنل اندھے نہیں ہوتے۔ لیکن ایک پاکستانی صاحب نے ان کو حیران کر دیا۔ ہوا یہ کہ یہ اپنی گلی میں سے گاڑی کو بیک کر کے نکالا کرتے تھے۔ ایک روز کوئی نغمہ گنگناتے ہوئے نکلے تو ایک گاڑی کے ٹکّر مار دی۔ مصالحت اُن کی طبیعت میں نہ تھی۔ اس لیے دوسرا فریق مجسٹریٹ کی عدالت

میں گیا۔ وہاں حاضر ہوئے اور کہا جناب میرا کوئی قصور نہیں۔ نہ اِن صاحب کا قصور ہے۔ ٹوکیو کی میونسپلٹی کو ہرجانہ دینا چاہیے کہ اُس نے گلی کے سِرے پر آئینہ نہیں لگایا جس میں گاڑی بیک کرتے ہوئے میں سب کُچھ دیکھ سکوں۔ میونسپلٹی کے وکیل نے کہا۔ ہم لاکھوں گلیوں کے سامنے آئینے نہیں لگا سکتے۔ جہاں خطرے کا ڈر ہے وہاں لگاتے ہیں۔ یہ خود احتیاط کیا کریں۔ اپنا بُرا بھلا دیکھا کریں۔ پاکستانی صاحب نے کہا۔ جناب ہمیں اس قسم کی احتیاط کی عادت نہیں۔ ہمارے ملک میں تو چھوٹی سے چھوٹی گلی کی نکّڑ پر آئینہ لگا ہے اس لئے ہمارے ملک میں ٹریفک کے حادثے نہیں ہوتے۔ مجسٹریٹ نے کہا واقعی؟ انہوں نے کہا اور کیا میری بات کا اعتبار نہیں؟ وہ بہت متاثر ہوا اور اُن کو بری کرتے ہوئے میونسپلٹی کو حکم دیا کہ اور کہیں لگاؤ نہ لگاؤ، اِن صاحب کی گلی کے سامنے آئینہ ضرور لگا دو۔ کیونکہ اِن کے مُلک میں ہوتا ہے۔ چنانچہ آئینہ لگ گیا۔

ہمارے ہاں اکثر یہ آواز اُٹھتی رہی ہے کہ اُردُو حروف گنجلک ہیں۔ رومن اختیار کرو۔ ملک بامِ ثریّا کو پہنچ جائے گا۔ ترکی والے اِسی بھرے میں مارے گئے۔ اپنے پرانے ادبی اور ثقافتی ورثے سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ جاپان کا رسم الخط ہمارے رسم الخط کے مقابلے میں سو گنا پیچیدہ اور گُنجلک ہے۔ سینکڑوں حروف ہیں۔ لیکن سارا مُلک



مجسٹریٹ نے میونسپلٹی کو حکم دیا کہ اور اِن صاحب کی گلی کے سامنے آئینہ لگادو۔

پڑھا ہوا ہے جب کہ ہمارے ہاں سو میں فقط اٹھارہ حرف شناس ہیں۔ اخبار ستّر ستّر لاکھ چھپتے ہیں۔ جاپانی زبان میں اوپر سے نیچے کو لکھتے ہیں اور اُردُو ہی کی طرح دہنے سے بائیں کی طرف چلتے ہیں۔ کیا ہمیں اُردُو کی طرح دہنے ہاتھ سے کھلتی ہیں۔ علم کی ترقّی کے وہاں ہزار پہلو ہیں۔ یہاں صرف ایک جھلکی دکھانی مقصود ہے۔ ایک روز

ہمارے دوست شمونا کا ہمیں اپنا پبلشنگ ہاؤس دکھانے لے گئے۔ اُن کی خصوصیات انسائیکلوپیڈیا اچھّا چھاپنا ہے۔ پہلے تو ان کے دفتر کی رفعت اور وسعت دیکھ کر ہماری عقل گُم ہو گئی۔ پھر ان کی کتابیں دیکھیں تو رہے سہے ہوش جاتے رہے۔ ہمارے ہاں کوئی سنجیدہ کتاب چھپتی ہے تو ایک ہزار نسخے نکلنے میں برسوں لگتے ہیں۔ انسائیکلوپیڈیا تو ہمارے ہاں ڈھنگ کی ایک بھی نہیں ہے۔ یہاں شمونا کا کے اشاعت گھر ہو بنشا میں ہم نے مختلف قسم کی انسائیکلوپیڈیاؤں کے متعلّق پوچھا۔ ایک اُن میں سے ۳۵ جلد میں ہے۔ قیمت اُس کی چار سو ڈالر یعنی چار ہزار روپے۔ ہم نے کہا صاحب اتنی مہنگی انسائیکلوپیڈیا کون خریدے گا۔ کتنی بِکتی ہے۔ معلوم ہوا کہ ہر ماہ دس ہزار سیٹ نکل جاتے ہیں۔ اور پچھلے دس سال میں پندرہ لاکھ سیٹ بِک چُکے ہیں۔ دوسری چھوٹی ہے۔ تین جلد میں قیمت چالیس ڈالر۔ اس کے اب تک بیس لاکھ سیٹ بِک چُکے ہیں۔ تیسری آٹھ جلد کی ہے۔ قیمت ستّر ڈالر۔ اِس کے پانچ لاکھ سیٹ نکلے ہیں۔ ہو بنشا کے عملے میں ڈیڑھ سو تو صرف کُل وقتی ایڈیٹر ہیں جو آنے والے مسوّدوں کو دیکھتے ہیں، جانچتے ہیں، مرتّب کرتے ہیں۔ اور یہ سب اِسی جِنّاتی رسم الخط میں ہوتا ہے اُس زبان میں جو جاپان سے باہر کہیں پڑھی نہیں جاتی۔ انگریزی کی طرح عالمگیر دائرہ نہیں رکھتی۔ رسالے اتنے نکلے ہیں کہ ان کے

انڈکس کے طور پر ایک مُستقل رسالہ نکلنا شروع ہوا ہے۔ موکوبی اس کا نام ہے۔ اس میں تین سو جاپانی رسالوں، ہفت روزہ وہ روزہ ماہانہ، سہ ماہی کی فہرست ہائے مضامین چھپتی ہیں اور کُچھ نہیں ہوتا۔ ضخامت سوا تین سو صفحے۔

بارش جب چاہے ہو جاتی ہے اس لیے اکثر جاپانی چھاتا لے کر گھر سے نکلتے ہیں۔ ہر ہوٹل کے برآمدے میں ایک چھاتا اسٹینڈ ہوتا ہے جس طرح ہمارے ہاں سائیکل اسٹینڈ ہوتے ہیں۔ آپ نے چھاتا اُس میں ٹکایا اور چابی نکال لی۔ چھوٹے ریستورانوں میں شیشے کے شوکیسوں میں کھانے کی بھری پلیٹیں نمائش کے لیے پڑی رہتی ہیں۔ آپ کو زبان نہیں آتی تو اشارہ کر دیجیے کہ یہ دے دیجیے۔ ہم سمجھے اصلی کھانا ہے۔ کسی نے بتایا کہ ہر چیز پلاسٹک کی بنی ہے۔ اب کے یہ پتہ چلا کہ نیچے تو سچ مُچ کا کھانا ہے اوپر پلاسٹک کی پھوار کی جھلّی منڈھی ہوتی ہے۔ وہ نظر نہیں آتی صرف کھانا نظر آتا ہے۔ خراب نہیں ہوتا۔ یونہی پڑا رہتا ہے۔

اپنے ہوٹل نیو اوتانی سے ہم دو ارمغاں لائے۔ ایک تو اپنی جان سلامت۔ دوسرے یہ دھوبی کی فہرست جس میں استری کرانے اور کپڑے دھلوانے کے ریٹ الگ الگ درج ہیں۔ یہی ہوٹل تھا جس میں کھانے کی صرف ایک پلیٹ سوا دو سو روپے کی تھی۔

استری کرانے کے ریٹ

سوٹ (تھری پیس)	۳۲روپے	کوٹ	۱۶روپے
سوٹ (دو پیس)	۲۸روپے	پتلون	۱۲روپے
اوور کوٹ	۲۸روپے	قمیص	۸روپے

ڈرائی کلینگ کے ریٹ

سوٹ (تھری پیس)	۷۶روپے	پتلون	۲۸روپے
سوٹ (دو پیس)	۴۶روپے	ٹائی (آپ کے خیال میں مُفت کر دیتے ہوں گے۔جی نہیں)	۸روپے

کوٹ	۳۶روپے	اوور کوٹ	۴۱روپے
قمیص	۲۲روپے		

زنانہ کپڑوں کے ریٹ بھی دیئے ہیں۔ کوئی بی بی اپنا پورا سوٹ ڈرائی کلین کرانا چاہے تو الگ الگ کپڑے کے حساب سے تو زیادہ رقم بیٹھے گی، یکجا طے کیجئے تو چھیانوے روپے میں۔ ہماری بات چھوڑیے کوئی تو یہاں کپڑے دھلواتا، استری کراتا ہو گا۔

ع بلا سے ہم نے نہ دیکھا ہے اور نہ دیکھیں گے



ایک خط وہاں سے

نہ عشقِ بُتاں ہے، نہ فکر معیشت

گزرتی ہے کیوں جاگتے رات ساری

یہ شعر بابائے اُردُو مولوی عبد الحق مرحوم کا ہے اور اس زمانے کا ہے جب رات بھر جاگنے کے یہی دو بہانے ہوا کرتے تھے یا کم از کم مولوی عبد الحق کے علم کی حد تک یہی تھے ورنہ تو کسی اُستاد کا شعر بھی ہے جس کا ہم یہاں صرف پہلا مصرع نقل کر

سکتے ہیں۔ ع

رات بھر یوں جی کے خوش کرنے کا ساماں کیجئے

دوسرا مصرع خطرناک اور خانزادہ قسم کا ہے۔ بہر حال اہلِ ذوق قارئین اِس سے آشنا ہوں گے۔ یہاں ذکر اپنے رات بھر جاگنے کا مقصود ہے۔ بلادِ مشرق کو جانے والے لفتانزا جہاز کو جانا نیم شب کو تھا اور اِس کے لئے ہم تیّار سرِ شام سے سو گئے تھے۔ لیکن گیا صبح آٹھ بجے۔ پورا سات گھنٹے لیٹ۔ ظالم نے رات بھر جگایا۔ فیض صاحب کے مصرعے گُنگُناتے رہے ع

پھر کوئی آیا دِل زار۔۔۔ نہیں کوئی نہیں

اب یہاں کوئی نہیں، کوئی نہیں آئے گا وغیرہ

اب کے کوہِ ندا سے ہمیں ندا آئی تو زمانہ ہی بدلا ہوا تھا۔ پہلا پڑاؤ تھائی لینڈ سیام۔۔۔ بنکاک بہت دِن نہیں ہوئے کہ یہ ملک امریکیوں سے زیادہ امریکی تھا۔ امریکہ کے بڑے جہاز یہیں سے پرواز کر کے جاتے تھے۔ ویت نام اور کمبوڈیا پہ آگ برساتے تھے۔ امریکیوں کے اِس یارِ وفادار اور فرزندِ دلبند نے ہند چینی میں امریکی تسلّط کی

بساط لپٹتی دیکھی تو اپنی کینچلی بھی اُتار دی اور جن کی راہ میں آنکھیں بچھاتا تھا اُنہی کو آنکھیں دِکھانے لگا۔ بنکاک کے سول ائیر پورٹ پر بھی ایک طرف کو فوجی طیّارے کھڑے دکھائی دیا کرتے تھے۔ ہم بینکاک کو چلے تو تھائی لینڈ کے وزیرِ اعظم پیکنگ کو روانہ ہو رہے تھے۔ یہی بنکاک تھا جس پہ دو سال پہلے پی آئی اے کا ایک طیّارہ پیکنگ سے آتے ہوئے موسم کی خرابی کی وجہ سے بہ مجبوری اُترا تھا تو مُلک میں ایمر جنسی کی کیفیّت پیدا ہو گئی تھی۔ فوج نے اُسے گھیرے میں لے لیا تھا۔ کیونکہ اس پر کُچھ چینی بھی سوار تھے۔ یہ بھی دیکھا وہ بھی دیکھ۔ تھائی لینڈ کے بعد یہ پرواز کبوڈیا پر سے گزری۔ ویت نام پر سے گزری۔ سائیگاؤں اور خلیج ٹونکن کے نام بھی پائلٹ نے لئے انہی چھ مہینے میں یہ جنگل کا جنگل ہرا ہو گیا تھا۔ بنجارا لاد گیا تھا اور اُس کا ٹھاٹھ پڑا رہ گیا تھا۔ بنکاک اور سائیگاؤں میں ہر دوسری عمارت یا تو نائٹ کلب تھی یا شراب خانہ تھی۔ یا حمّام تھی۔ ایسا حمّام جس میں سب ننگے ہوا کرتے تھے۔ عام معنوں میں بھی اور سیاسی معنوں میں بھی۔ آخر فنا، آخر فنا۔۔۔

ہمارا سفر ہمیشہ کراچی کی سرکاری ہینڈی کرافٹ شاپ سے شروع ہوتا ہے۔ جاپانی دوستوں کے لئے چھوٹے بڑے تحفے فراہم کرنے کے لئے سنگِ سبز کی چیزیں، کشیدہ کاری کی چیزیں، تانبے، پیتل کی منقّش چیزیں۔ ورائٹی بہت کم چہ کند بے نوا ہمیں

دارد۔ خرابی کی بات یہ ہے کہ یہاں ہر چیز ننگی بُچی ملتی ہے یا خالی براؤن پیپر کے لفافے میں ڈال کے دے دیتے ہیں۔ کہ گر قبول افتدز ہے عزو شرف۔ کئی بار کہا اور لکھا کہ صاحبو۔ اچھی پیکنگ بھی ایک چیز ہوتی ہے۔ لینے والے کا بھی جی خوش ہوا، دینے والے کا بھی خوش ہو۔ یوں تو پہلے بھی کون سا سستا دیتے ہو لیکن ڈبّے ہوں اور پھول دار کاغذ میں سلیقے کی پیکنگ ہو تو روپے دو روپے زیادہ سہی۔ ہانگ کانگ اور جاپان اور چین میں کوئی چیز خریدیے تو چیز تو پھینکنے کو شاید جی چاہے لیکن لفافہ اور ڈبّہ پھینکنے کو جی نہ چاہے گا۔ بلکہ اُن کے ساتھ پلاسٹک کا خوب صورت بیگ بھی مُفت نذر۔ جو لوگ یہ دُکانیں چلاتے ہیں۔ سرکاری شاپ والے بھی اور بازار والے بھی۔ اُن کو کہیں بھیج کر اِس فن کی تربیت بھی دِلانی چاہیئے۔ چھوٹے موٹے ڈبّے بھی بنوانے چاہئیں۔ آخر قمیصوں، موزوں، دواؤں والے بنواتے ہی ہیں۔ ٹورزم کے فروغ کے لئے جوا گھر بنانے سے ہم منع نہیں کرتے کیونکہ ہمارے تخیّل کی پرواز یہیں تک جاتی ہے لیکن یہ چھوٹی چھوٹی چیزیں زیادہ اہمیت رکھتی ہیں۔ یہ جو لاکھوں ٹورسٹ ہماری حیثیت کے متوسّط اور سستے ہوٹلوں میں ٹھہرتے مُلک مُلک کے تحفے خریدتے پھرتے ہیں۔ اِن میں کتنے ہیں جن کو شراب اور جوا گھر کی کشمش کھینچ کے لاتی ہے۔ یہ چیزیں تو ان کے اپنے ملکوں ہی میں موجود ہیں۔ کاسینو کے لئے

کوئی ہمارے ہاں کیوں آئے گا۔ بیروت، پیرس، ہانگ کانگ کیوں نہ جائے گا۔ اسی دُکان پر شیشے کے ٹکڑوں اور موتیوں سے مزیّن کُچھ جانور بھی ملتے ہیں، گدھا ملتا ہے، اونٹ ملتا ہے، ہاتھی ملتا ہے۔ اِن میں گدھے کی قدر اور قیمت دونوں جانوروں سے زیادہ ہے۔ اونٹ ہزار اسلامی جانور سہی اور ہزار اکبر الہ آبادی اُس کے گُن گاتے ہوں۔ لیکن بازارِ جہاں میں اب بھی سستا ملتا ہے۔ تیل نکلنے کے بعد مشرقِ وسطیٰ کے اونٹ کی قیمت بے شک کُچھ بڑھی ہے اور اِس کی سب کلیں سیدھی ہو گئی ہیں لیکن ہمارااونٹ آخر ہمارااونٹ ہے۔ ہاتھی اِس دکان پر ہم نے سستا پایا۔ حالانکہ اِس کے پاؤں میں سب کا پاؤں ہونا چاہیے تھا۔ اونٹ کا بھی، گدھے کا بھی۔ آخر ہم نے بھی لیا لیکن یہ فکر لاحق تھی کہ اگر کسی نے پوچھ لیا کہ تمہارے ملک میں یہ کہاں ہوتا ہے اور اِس کے کھیدا کرنے کی کیا ترکیب ہے تو کیا جواب دیں گے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے دفتروں میں ہوتا ہے جس کو یقین نہ ہوا کہ دیکھ لے اور اِس کا کھیدا نہیں کیا جاتا۔ یہ لوگوں کا کھیدا کرتا ہے۔

ہانگ کانگ میں بارش ہو رہی ہے اور جہاں ہم دوپہر کو اترنا چاہتے تھے، رات کا سماں ہے۔ رات کے دس بج رہے ہیں۔ گرمی ہے۔ ہمارا یہ ہوٹل پلازاہوٹل ہمارے لیے بناہے۔ دور جزیرہ ہانگ کانگ پر قلّہ کوہ کے دامن میں ہے، نقشے سے بڑی مُشکل سے

اِس کا اتا پتہ ملا اور ہمارا دِل بیٹھ گیا۔ اِس وقت ہم اس کے کمرہ نمبر ۱۱۴۷ میں فروکش ہیں۔ نقشہ دیکھ رہے ہیں اور ٹیلی ویژن کھول دیا ہے جس میں ایک سے ایک حسینہ طنّاز آ رہی ہے۔ ٹیلیویژن بھی رنگین ہے۔ ہمارے پاس دو عینکیں ہیں، ایک پڑھنے کی، ایک دیکھنے کی، ایک علمی کاموں کے لئے، دوسری غیر علمی کاموں کے لئے۔ یہ سطور ہم پڑھنے کی عینک لگا کر لکھ رہے ہیں لیکن ٹیلیویژن پہ یک دم سیلابِ حُسن آ جاتا ہے تو دوسری لگانی پڑتی ہے۔ دمِ تحریر یہ سیلاب زیادہ ہی ٹھاٹھیں مارنے لگا ہے اور پیاز کے سے چھلکے یکے بعد دیگرے اتر رہے ہیں۔ دیکھئے اندر سے کیا بر آمد ہوتا ہے۔ ہم میں شوقِ تحقیق اور تجسّس ہمیشہ سے ہے لہٰذا اِس وقت ہم دوسری غیر علمی کاموں والی عینک لگانے پر مجبور ہیں۔ پس اِس سفر نامے کو آج یہیں ختم سمجھیے۔

شب بخیر۔ ارے آپ کے ہاں تو ابھی شام کے چھ ہی بجے ہوں گے۔



کپڑے اُتار کر مسافروں کی تلاشی

ہانگ کانگ سے آگے

یوں تو امیگریشن والے آنے والے پردیسیوں کے معاملہ میں میں میکھ ہر جگہ نکالتے ہیں۔ لیکن ہانگ کانگ والے کُچھ زیادہ خوردہ گیری کرتے ہیں۔ ٹوکیو ہو یا بنکاک ہو یا کراچی ہو، یہاں مقناطیسی دروازے سے گزارنا اور مقناطیسی مشین آپ کے کپڑوں پر پھیرنا کافی ہوتا ہے۔ ایک آدمی آپ کی جیبوں کپڑوں پہ ہاتھ پھیرتا ہوا تلاشی بھی لیتا ہے، پِنڈلیاں بھی تھپتھپاتا ہے کہ اِن کے ساتھ چاقو یا پستول تو نہیں باندھ رکھا۔ لیکن اِس تمام دوران میں آپ کی گھڑی، آپ کے قلم، آپ کے پیسے دھیلے

آپ کی جیب میں رہتے ہیں۔ ہانگ کانگ میں البتّہ یہ نکلوائے جاتے ہیں اور ایک پلاسٹک کے لفافے میں بند کر کے الگ رکھ دیئے جاتے ہیں۔ اِس کے بعد آپ کو مقناطیسی دروازے سے گزارتے ہیں۔ گویا صرف ہانگ کانگ والے ہیں جو قلم کو بھی ہتھیار سمجھتے ہیں، روپے پیسے کو بھی اسلحہ قرار دیتے ہیں۔ دیکھا جائے تو کچھ غَلَط بھی نہیں کرتے۔ ع

دوانے ہیں لیکن بات کرتے ہیں ٹھکانے کی

ہانگ کانگ میں آپ کا پاسپورٹ چیک کرتے ہوئے آپ کو دیکھا بھی ایسے شُبہے اور خشونت کی نظر سے جاتا ہے کہ آپ خود اپنے کو مفرور اور اشتہاری مُجرم سمجھنے لگتے ہیں۔ ہمیں کھٹکا اِس لئے بھی لگا رہتا ہے کہ ہمارے پاسپورٹ پر ہماری تصویر کچھ پُرانی ہے اور ہمارے اصلی اور نقلی، قلمی اور تُخمی نام مل کر اتنے لمبے ہو جاتے ہیں کہ ہم خود بھول جاتے ہیں کہ ہم کیا کرتے ہیں۔ ہمارا کرسچن نام پوچھا۔ ہم نے کہا ہم کرسچن نہیں ہیں۔ الحمد لِلہ مسلمان ہیں۔ بولے فیملی نام۔ ہم نے کہا انشا لکھتے، ابنِ انشا لکھیے۔ کچھ بھی لکھ لیجئے۔ غور سے دیکھ کر بولے۔ آپ کا خاندانی نام تو مسٹر خان معلوم ہوتا ہے۔ یہ کہہ کر وہ اس رجسٹر کی ورق گردانی کرنے لگے جن میں خان نام کے مُشتبہ لوگوں، مجرموں، سٹّہ بازوں، نشہ فروشوں، اسمگلروں وغیرہ کے نام درج

ہیں۔ ہم نے کہا اے صاحب ہم خان وغیرہ کُچھ نہیں ہیں اور اگر ہیں تو نام کے ہیں۔ یہاں شب بھر کو کہیں ٹکیں گے۔ کل ٹوکیو کا عزم ہے۔ یونیسکو کے کام سے جا رہے ہیں۔ یہ رہا یونیسکو کا خط۔ اُسے دیکھا تو اِن صاحب کے جی میں نیکی آئی اور انہوں نے ٹھپ سے منظوری کی مہر لگائی۔

ہم نے اِس دوپہر سے اُس دوپہر تک پورا چوبیس گھنٹے کا دِن ہانگ کانگ کے لئے رکھا تھا لیکن اِس میں کھنڈت کراچی ہی میں پڑ گئی تھی اور اب بس صبح سے دوپہر تک ہمارے پاس تھے۔ ہمارا یہ پروگرام کہ اٹھائیں گے ڈھول اور تاشے اور جائیں گے میکاؤ اب کے پانچویں بار بھی غارت ہوا۔ دیکھیں واپسی میں سبیل بنتی ہے یا نہیں۔ لیکن واپسی میں منیلا کا خیال ہے۔ بلکہ پیکنگ کے راستے واپسی کا بھی احتمال ہے۔ اب ہانگ کانگ میں ہمارے لئے کوئی کشش نہیں۔ جو شخص ٹوکیو جاتا ہے اُسے ڈھنگ کی چیز بھلے داموں جاپان ہی میں مل جاتی ہے، ہانگ کانگ کی طرح بھاؤ تاؤ اور چیز کے کھرا کھوٹے ہونے کا کھٹکا نہیں ہوتا۔ اب تو ظالم ہر چیز کی نقل ہانگ کانگ میں بناتے ہیں۔ اِس کالونی کے نئے علاقہ جات میں فیکٹریاں ہی فیکٹریاں ہیں۔ ہر طرح کا مال بناتی ہیں اور ہر طرح کی اُس پہ مہر لگاتی ہیں۔ نشے بازی، جوا، نائٹ کلب ہر طرح کا تماشہ یہاں ہے۔ بد معاشی کے بین الاقوامی اڈّوں میں ایک یہ بھی ہے جس پر یونین

جیک لہراتا ہے۔ رات کو جزیرہ ہانگ کانگ کی پہاڑیوں پر مکان در مکان اور روشنی در روشنی کا سِلسِلہ دیکھنے کا ہوتا ہے۔ روشنیاں اونچی ہی اونچی چلی جاتی ہیں۔ اور اِدھر سمندر چمکتا ہے۔ ہوٹل اچھّا ہے لیکن کمرے کی کھڑکی غَلَط رُخ کو کھلتی ہے۔ دیکھا تو کچھ نظر نہ آیا۔ آخر پردہ کھینچ لیا ہے۔ میر صاحب کے تتبع ہیں اپنے اندر کی کھڑکی کھولتے ہیں لیکن اے صاحبو! آپ سے کیا پردہ۔ اِس وقت تو اُس میں بھی کُچھ نظر نہیں آنا۔ فی الحال ہم ویران جھروکوں اور خالی دریچوں کی منزل میں ہیں۔ فی الحال۔

پس ہم نے خریداری سے ہاتھ اٹھایا اور میکاؤ سے ہاتھ اُٹھایا۔ ہم تو سیدھے اُسی جہاز سے ٹوکیو چلے گئے ہوتے۔ پھر سوچا کہ آدھی رات کے بعد کا سماں ہو گا۔ اس وقت ہمیں کون لینے آیا ہو گا۔ یا آئے گا۔ علی الصبح مُشتاق صاحب کو فون کیا۔ ہانگ کانگ میں نیشنل بینک آف پاکستان کا ایک بڑا دفتر ہے جو مشرقِ بعید کا ہیڈ کوارٹر ہے۔ مشتاق صاحب اِس دفتر کے سربراہ ہیں۔ سینئر وائس پریذیڈنٹ وغیرہ۔ پچھلی بار ہم نے اِن کی مدارات سے فائدہ اُٹھایا تھا۔ اب کے بھی فون کیا تو کھِل گئے۔ بولے یا حضرت گاڑی بھیجتا ہوں آجاؤ۔ ہم نے کہا فی الحال ہمیں ٹرام کا اور فیری کا لُطف اٹھانے کو تنہا چھوڑ دیجیے۔ ہم اپنے پاؤں کولون جاتے ہیں۔ وہاں پنجاب ہاؤس جائیں

گے جو ہمارے دس برس سے دوست چلے آ رہے ہیں۔ وہاں سے خود ہی قریب دوپہر آپ کے پاس آ جائیں گے۔ پنجاب ہاؤس ہمارا پُرانا اڈّہ ہے۔ اِن لوگوں کی معرفت اظفر شفقت سے بات ہوئی اور انہوں نے فرمایا کہ میں بھی نیشنل بینک میں آپ کا انتظار کروں گا۔ اظفر صاحب ہماری فارن سروس میں ہیں۔ ہانگ کانگ میں وائس قونصل جنرل ہیں۔ قونصل جنرل امان اللہ ظفر ہیں۔ بڑے صاحبِ ذوق ہیں بلکہ شاعر۔ اب کے وہ بستی میں موجود نہ تھے۔ کہیں باہر گئے ہوئے تھے۔ بہر حال ہم نے اپنا فیری کے سفر کا شوق پورا کیا۔ اور مشتاق صاحب کے ہاں جا براجے۔ وہاں سے اظفر شفقت نے ہمیں اُچک لیا۔ بہت مزے کے مطالعے کے اور نفیس ذوق کے آدمی ہیں۔ جب تک ہم نے جہاز پر سوار ہونے کے لئے زینے پر قدم نہیں رکھ دیا ہمارے ساتھ رہے۔

ہانگ کانگ اب بہت کُچھ بدل رہا ہے پرانی عمارتیں ڈھے رہی ہیں۔ نئ اِن کی جگہ لے رہی ہیں۔ الیگزینڈر ہاؤس یہاں یعنی جزیرہ ہانگ کانگ کی مشہور کئ منزلہ عمارت بھی بڑی عالی شان سمجھی جاتی تھی۔ اب دیکھا کہ اِس کی بنیادیں تک کھود پھینکی ہیں اور نئے آثار کھڑے ہو رہے ہیں۔ اب یہاں اِس سے دُگنی اونچی اور دُگنی عالی شان ساختمان کھڑی ہو گی۔ اِس کے نواح میں اب چوک پر پرانا ڈاک خانہ ہی

پرانے دور کی آثارِ باقیہ میں سے رہ گیا ہے۔ بھلا لگتا ہے۔ پَون صدی پہلے سارا ہانگ کانگ اِسی کے نمونے کا رہا ہو گا۔ اب دیکھئے یہ کب تک وقت کا مُقابلہ کرتا ہے۔ اختر الایمان کی مسجد کی طرح۔

تیز ندی کی کوئی موجِ تلاطم بر دوش

چیخ اُٹھتی ہے کہیں دور سے فانی فانی،

میں بہادوں گی تُجھے توڑ کے ساحل کی حدود

اور پھر منبر و محراب بھی پانی پانی،

مغرب سے مشرق کو جائیں تو بہت جلد جلد وقت بدلتا ہے۔ ابھی ناشتے کے برتن اُٹھائے بھی نہیں ہوں گے کہ لنچ پروسنا شروع کر دیتے ہیں اور لنچ کا میٹھا ابھی مُنہ میں ہوتا ہے کہ میزبان بیبیاں ڈنر تقسیم کرنے کے لئے سچ مُچ کمر بستہ ہو جاتی ہیں۔ اور درمیان میں اگر کوئی فاصلہ ہے تو اُسے چائے، بسکٹ، کوکا کولا، جوس وغیرہ سے پُر کرتے ہیں۔ ہم کھانا کھا چکے تھے۔ اظفر شفقت نے زبردستی کھلا دیا تھا کہ تین بجے کے بعد لنچ کون دے گا۔ جہاز میں پہنچتے ہی ہماری خاطر عاطر شروع ہو گئی۔ پہلے

شیشے اور کنڈ کسی دلفزا مشروب کے آئے۔ ہم ہاتھ بڑھانے کو تھے کہ دِل کے اندر سے کوئی پارسا پُکارا۔ ظالم شراب ہے، ارے ظالم شراب ہے۔ ہم نے کہا۔ مولوی صاحب۔ ہم کون ساپی رہے تھے۔ بس دیکھ رہے تھے۔ تم کہو تو دیکھیں بھی نہیں۔ اب ایک بی بی ہمارے پاس آئیں کہ آپ ہی وہ صاحب ہیں جنہوں نے کراچی میں ہدایت کی تھی کہ میرے لئے حلال گوشت وغیرہ کا انتظام کیا جائے۔ ہم نے کہا بے شک لیکن ہمیں اصرار صرف اِس پر ہے کہ حرام گوشت نہ ہو۔ یعنی وہ جانور نہ ہو۔ باقی چکن یا مٹن تو جیسا بھی ہے چل جائے گا۔ بولیں نہیں۔ آپ کے لئے خاص الخاص انتظام ہے۔ چنانچہ وہ سربستہ خوان لائیں جس پر بجا بجا مُہریں لگی ہوئی تھیں کہ یہ کوشر یعنی یہودی طرز کا ذبیحہ ہے۔ حتّٰی کہ میٹھے کی پلیٹ پر کوشر کی مُہر لگی ہوئی تھی اور مُہر یہی نہیں، سرٹیفکیٹ بھی مُنسلک تھا کہ من مسمّی ربّی اعظم شہر زیورچ تصدیق کرتا ہوں کہ یہ کھانا کوشر ہے، ہماری نگرانی میں تیّار ہوا ہے۔ اِس بی بی نے ڈرتے ڈرتے ہم سے پوچھا کہ آپ یہودی لوگ پورک کیوں نہیں کھاتے۔ اس پر ہمیں دو وضاحتیں کرنی پڑیں، ایک یہ کہ کیوں نہیں کھاتے۔ دوسرے یہ کہ ہم یہودی نہیں ہیں۔ بولیں کُچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ فلسطین میں اُن سے لڑتے ہو، یہاں اُن کا کھانا منگا کے کھاتے ہو؟ وہ بی بی سوال کرنے والی جاپانی تھی۔ ہماری

الہیات کو کیا سمجھتی اور ہمارے فقہ کو کیا سمجھتی۔ ع

ہم ہنس دیے۔ ہم چُپ رہے۔ منظور تھا پردا ترا

ٹوکیو پہنچ گئے

ٹوکیو میں ہمارے دوست امان اللہ سردار جب بھی بازار میں اپنی گاڑی کھڑی کر کے خریداری کو نکلتے تھے۔ ہم اُن کو یاد دلاتے تھے کہ بھائی شیشے تو چڑھا دو اور لاک تو کر دو۔ وہ مُسکرا کر ٹال جاتے تھے۔ ایک دِن ہم نے کہا آپ ہمارے مفید اور مُفت مشورے پر کان کیوں نہیں دھرتے۔ کسی روز آپ کو یہ گاڑی ٹوکیو کے فیڈرل بی ایریا کے کسی دور اُفتادہ علاقے میں یوں ملے گی کہ جسم ہی جسم ہو گا روح نہیں ہو گی، باڈی ہو گی انجن غائب پُرزے غائب۔ بولے نہیں بھائی یہ ٹوکیو ہے ایسا اندھیر

نہیں۔ اب کے ہم ٹوکیو کے ہوائی اڈّے پر اُترے تو نوٹس لگا پایا کہ

"صاحبان! اپنے مال کو یک دم اپنے ہاتھ سے جُدا نہ ہونے دیجئے۔ چوریاں بہت ہونے لگی ہیں۔ منجانب ایسوسی ایشن برائے انسدادِ جرائم ٹوکیو ائیر پورٹ۔"



اپنے مُلک میں گاڑی کی حفاظت

ہمیں تھوڑا اطمینان ہوا کہ ہاں ابھی اِس مُلک میں ایشیا کی خُو بُو باقی ہے۔ کوئی نہ کوئی چیز ہم میں اِن میں مُشترک ہے۔ ورنہ تو ہم یہ سوچ کر مایوس اور دِل گرفتہ ہو گئے

تھے کہ یہ نام کے ایشیائی ہیں۔ ان لوگوں سے ہمارا گزارہ نہیں۔ ہم کاہل یہ محنتی، یہ گاڑیاں، ریڈیو ٹیلیویژن بنانے والے، ہم کولہو کے بیل۔ ہم گندگی پسند، یہ صفائی پسند۔ ہم بے ایمان، ملاوٹیے، رشوت خور یہ ایماندار، ملاوٹ نہیں کرتے۔ رشوت سُنا ہے کھاتے کھلاتے ہیں لیکن بین الاقوامی سطح پر غیر مُلکی پارٹیوں سے سودے کرتے وقت جھوٹی رشوت کی بخششیں تک کا رواج نہیں۔ بلکہ غیر ملکی ٹورسٹوں سے درخواست کرتے ہیں کہ صاحبان ٹِپ دے کر ہمارے آدمیوں کی عادتیں خراب کرنے کی کوشش نہ کیجئے۔ اب کے ٹوکیو ائیر پورٹ پر یہ نیا نوٹ لگا دیکھ کر دِل کو یہ گمان بھی ہوا کہ کہیں یہ ہمارے بار بار ٹوکیو آنے یعنی اثرِ صحبت کا نتیجہ تو نہیں لیکن کِسی سے ذکر نہ کیا کہ بات پھیل جائے گی۔

ہوٹل گرینڈ پیلس مرکزِ شہر میں تو نہیں لیکن اچھّا ہوٹل ہے تو ایسا نہیں جس میں ہم پچھلی بار ٹھہرے تھے کہ بستر اور غُسل خانہ تو تھا لیکن وارڈروب نہ تھا اور روم سروس کا انتظام نہ تھا یعنی آپ اپنے کمرے میں چائے یا ناشتہ نہیں منگا سکتے تھے۔ کپڑے باہر کھونٹی پر ٹانگنے پڑتے تھے۔ آج ہم نے سوٹ کیس کھول کے سوٹ نکالا کہ کل صُبح نو بجے کے جلسے میں پہننا ہے دیکھا کہ باوجود احتیاط کے سِلوٹیں پڑ گئی ہیں۔ پہلی چورنگی پر "سمار ٹیلا" والے باکمال آدمی ہیں۔ انہوں نے ہمارا سوٹ بے تکلّف ۴۸

گھنٹے میں سی کر ہانگ کانگ کی مثال قائم کر دی تھی لیکن سِلوٹیں ہمارا اور ہمارے کپڑے کا داخلی معاملہ تھا۔ رات کے دس بجے تھے۔ نیچے کاؤنٹر پر فون کیا۔ انہوں نے کہا صاحب ہمارا دھوبی اور الّو کرنے والا اِس وقت تو نہیں ہوتا۔ صبح بھی نو بجے تک نہ دے سکے گا۔ امان اللہ سردار کو فون کیا کہ مشورہ دو۔ علی الصبح فیشن کے تقاضے کیسے پورے کریں۔ یہ تو نہ معلوم ہو کہ ابھی ابھی مٹکے سے نکالا ہے سوٹ۔ فرمایا غُسل خانے میں لٹکا دو۔ اور گرم پانی کی دھار چھوڑ دو۔ ہم نے کہا بھیگ جائے گا۔ فرمایا سوٹ پہ دھار چھوڑنے کو نہیں کہہ رہا۔ ٹب میں چھوڑو۔ سوٹ کھونٹی سے لٹکا دو۔ اندر بھاپ پھیلے گی تو خود ہی شکنیں نکال دے گی۔ یہ نسخہ ہم نے آزمایا لیکن نہ چلا۔ ایک چپٹے تلے والی ایش ٹرے پڑی تھی۔ اُسے گرم پانی میں گرم کر کے استری کا کام لینے کی کوشش کی۔ بات نہ بنی۔ اب ہم نے اپنا رومال گرم پانی میں بھگو بھگو کر اور نچوڑ نچوڑ کر شِکنوں کو سیدھا کرنا شروع کیا۔ ایلو۔ سارے بل نکل گئے۔ اب یہ نسخہ خلقِ خُدا کے فائدے کے لیے مشتہر کیا جاتا ہے۔ ڈھنگ سے استعمال کیا جائے تو رسّی تک کے بل نکل جاتے ہیں۔ بلکہ آدمی تک کے۔ عشق کے استعمال کی ضرورت نہیں ع

اقبال تیرے عشق نے سب بل دیے نکال

یونیسکو کے ایشین کو پبلیکیشن پروگرام میں ایشیا کے بیس ملک شریک ہیں۔ افتتاحی جلسہ ہوا تو ہمیں یعنی پاکستان کو تیسری بار اِس پروگرام کا وائس چیئر مین اور اِس کے مرکزی ایڈیٹوریل بورڈ کا رُکن منتخب کر لیا گیا۔ کوئی اور مُلک دوسری بار بھی اِس سعادت کا سزاوار نہیں ٹھہرا۔ ہم نے واجبی سی معذرت کرنی چاہی اور کی بھی کہ اب کے کسی اور مُلک کو بنایا ہوتا۔ لیکن خیر شکریہ۔ شکریہ جلدی سے اِس لئے کہ یہ اعزاز ہمارا نہیں پاکستان کا ہے۔ ۱۹۷۳ء میں جب کہ ہم نے بنگلہ دیش کو منظور نہیں کیا تھا اور جذباتی کشید گی خاصی تھی، افغانستان نے بنگلہ دیش کا نام تجویز کر دیا۔ ہم نے سانس روک لی لیکن خیریت یہ ہوئی۔ کہ کوئی تائید کرنے والا نہ ملا۔ حتّٰی کہ ہندوستان بھی چُپ بیٹھا رہا۔ اِدھر سری لنکا نے ہمارا نام تجویز کیا، اور وہ فوراً اتّفاق رائے سے منظور ہوا۔ ویسے بنگلہ دیش سے سوائے ایک صاحب کے جو ۱۹۷۲ء میں آئے تھے اچھّے بھلے شریف آدمی ہی آتے رہے ہیں۔ اب کے جو صاحب آئے بنگالی دوستوں کی خیریت کے پیغام بھی لائے۔ جسیم الدّین کے متعلّق البتّہ سُنا کہ بیمار ہیں۔ اِن صاحب سے تو سیاست اور حالات پر کوئی بات نہ ہوئی۔ ایک اور جرنلسٹ جہاز میں ملے تھے اُن سے معلوم ہوا کہ وہاں آٹے دال کا بھاؤ کیا ہے۔ چاول چار سے چھ روپے سیر، بناسپتی گھی ناپید، سرسوں کا تیل ناپید، باہر سے سویا بین کا تیل آتا

ہے۔ بقدر اشکِ بُلبُل ملتا ہے۔ نہانے کا صابن لکس بھی راشن میں فی فیملی ایک ٹکیہ فی ہفتہ، کپڑے دھونے کا صابن فی فیملی فی ہفتہ دو ٹکیہ، دھوبی قمیص کی دھلائی دو روپیہ لیتا ہے۔ سیمنٹ ساٹھ ستر روپے بوری اور نایاب ۱۹۷۰ء میں پانچ روپے میں ملنے والی لُنگی چھتّیس روپے کی۔ اور آٹھ روپے والی اڑتالیس روپے کی۔ لکھنے اور کتابیں چھاپنے والے سفید کاغذ کا کال۔ ٹیلی ویژن کا سیٹ جو ہمارے ہاں سولہ سترہ سو کا ملتا ہے، وہ چھ ہزار روپے کا۔ امریکی ڈالر کی سرکاری قیمت آٹھ ساڑھے آٹھ روپے۔ بازار میں بائیس سے لے کر پچیس روپے تک۔ بھوک بد حالی اور ہندوستان کی سرحد پر سمگلنگ۔ ہم پاکستان کے سوتی کپڑے کی پتلون پہنے ہوئے تھے۔ معمولی قیمت کی۔ اِس پہ ہاتھ پھیر کر انہوں نے آہِ سرد بھری اور کہا۔ لوگ پاکستانی کپڑے کو یاد کرتے ہیں۔ لہٰذا اب ہندوستان والے اپنے کھُردرے کپڑے میں میڈ ان پاکستان کی مُہر لگا کر اِدھر بھیجتے ہیں۔ بعض لوگ اِن باتوں پر خوش ہوتے ہیں، ہمارا تو دِل بہت ملول ہوا۔

یورپ اور ایشیا کے ہوٹلوں میں اسٹیشنری کے ساتھ ساتھ آپ کو انجیل ضرور ملے گی۔ مشنریوں کی کسی سوسائٹی نے زرِ کثیر خرچ کر کے ہزاروں لاکھوں جلدیں ہوٹلوں میں تقسیم کر رکھی ہیں۔ یہ گرینڈ پیلس ہوٹل میں بھی تھی۔ ہم نے حسبِ

عادت اِسے چوم کے رکھ دیا۔ دیکھا کہ ایک اور کتاب ہے۔ حضرت بُدھ کی تعلیمات پر مشتمل تھی۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ اِس ترکیب سے ہوٹلوں میں قیام کرنے والے خدا ترس ہو جاتے ہیں، نیک ہو جاتے ہیں۔ کسی کو کمرے میں کوئی بات اخلاق اور نیکی کے تقاضوں کے منافی کرنی ہو تو حضرت عیسیٰ اور حضرت بُدھ اُس کے ہاتھ پکڑ لیتے ہیں۔ جی نہیں۔ اپنی عزّت اپنے ہاتھ ہے۔ اپنی اپنی کتاب سمیت کمرے کے کونے میں اکیلے پڑے رہتے ہیں۔ تاہم تبلیغ کا شوق رکھنے والوں کو ہمارے ملک میں یہ بھی خیال نہیں آیا کہ ہوٹلوں میں قرآن مجید مع آسان ترجمے کے ہر کمرے میں رکھوا دیں۔ بے شک یہ خطرہ ہے کہ کُچھ لوگ ہماری کتابِ مقدّس ہی کو اٹھا لے جائیں اور کسی ضرورت مند سے ہدیہ وصول کریں لیکن شاید کوئی پڑھ بھی لے۔

اتنا حُسن کیا کرو گے

ہمارے ہاں تو انکسار وغیرہ برتنے کے لئے کہتے ہیں۔ دال روٹی حاضر ہے۔ ٹوکیو میں ایک دوست نے فرمائش کی کہ بھئی آیا کرو تو ہمارے لئے دال لایا کرو کیونکہ ٹوکیو میں تو گوشت ملتا ہے، سبزی بھی مل جاتی ہے، خواہ سونے کے تول ملے، دال نہیں ملتی۔ یوکوہاما یا کوبے میں کُچھ دکانیں ہیں، وہاں ملتی ہے تو پچاس روپے سیر ملتی ہے۔ جیسا کہ ہم نے خود اُردُو کی آخری کتاب میں لکھا ہے، دال اب پاکستان میں بھی مہنگی ہے۔ حتّٰی کہ وہ لڑکیاں جو مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی کے زمانے میں دال بگھارا کرتی

تھیں، اب فقط شیخی بگھار کر رہ جاتی ہیں۔ لیکن ٹوکیو کا آٹے دال کا بھاؤ ہم سے دس گنا آگے ہے۔ دال کا تو نہیں کہہ سکتے، پودے، پھل اور دوسری اشیائے خوردنی کے باہر سے جاپان لانے کی مناہی ہے۔ ایک صاحب تحفے میں آم لے کر گئے تھے۔ ائیر پورٹ والوں نے روک لیا کہ نہیں جا سکتے ہیں۔ یہیں تیل ڈال کر جلا جھُلس دیئے جائیں گے۔ زر کھانے کے مصداق اِن صاحب نے وہیں بیٹھ کر پوری ٹوکری کے آم چوسے۔ کیا عجب دال کے باب میں بھی احتیاط کرتے ہوں کہ کوئی بیماری کا کیڑا نہ اِن سے چمٹا ہو۔ کوئی جراثیم نہ اِن سے پیوست ہوں۔ یہ تو اشیائے خوردنی ہیں، سُنا ہے ٹوکیو ایئرپورٹ پر پی آئی اے کی جو پہلی پرواز ڈی سی جہاز کی ٹوکیو گئی، وہ خالی تھی۔ توازن قائم رکھنے کے لئے اِس میں ڈیڑھ ٹن اینٹیں رکھ دی گئی تھیں، واپسی میں بہت سا کارگو مل رہا تھا۔ پی آئی اے نے چاہا کہ اینٹیں پھینک دے اور وہ بوجھ اٹھائے جس کا بیش قدر کرایہ ہوتا ہے۔ جاپانی حکومت نے اجازت نہ دی کہ اینٹوں میں پاکستانی آلودگی ہوگی۔ پاکستانی کیڑے ہوں گے، پاکستانی جراثیم ہوں گے۔ پس وہ ساری اینٹیں ٹوکیو سے واپس لانی پڑیں۔ شاید منیلا میں پھینکی گئی، یا کراچی لائی گئیں۔ پلانٹ پروڈکشن کا ایک آدمی کراچی ائیرپورٹ پر بھی ہوتا ہے، اِسی قسم کی احتیاط کے لئے۔ لیکن ہمیشہ یہ سُنا کہ چائے پینے گیا ہوا ہے۔ محکمہ کو

چاہیے کہ اُسے پانی کی کیتلی فراہم کر دے، وہیں بیٹھا بناتا رہے، پیتا رہے۔



آم چوس کر گٹھلیوں کے ڈھیر

گیشا گھر کا نام آیا اور لوگوں کے منہ سے رال ٹپکی۔ ریشہ خطمی ہوئے۔ خیال کے اُڑن کھٹولے پر سوار حُسن و رومان کی وادیوں میں کھو گئے۔ ٹوکیو کے نائٹ کلب بھی مشہور ہیں۔ لوگ اپنے تخیّل میں دونوں کو گھلا ملا کر نقشہ تیّار کرتے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ گیشائیں اربابِ نشاط ہوتی ہیں۔ اور گیشا گھر کوئی خانقاہ نہیں ہوتی۔ دِل کے

خوش کرنے کا بہانہ ہے اور لہو و لعب کا کارخانہ ہے، تاہم کوئی سیانا مانے تو عرض کریں کہ اِس میں اب ہم کو خانقاہی رنگ زیادہ نظر آنے لگا ہے اِس کی برسوں نہیں، صدیوں پرانی روایت کی وجہ سے اندازِ نشست و برخاست، دِل پرچانے کے طریقے، طعام، کلام، میوزک، اس کی حیثیت تہذیب سکھانے کے لئے چوک کے کوٹھے کی سی ہے۔ امراؤجان کا بالاخانہ سمجھئے۔ پہلی بار آج سے نو برس پہلے ہم نے جن بیبیوں کے گلے میں ہاتھ ڈال کر ساکورا، ساکورا کا نغمہ لگایا تھا سر پر سمورائی کی سرپوش نماوِگ پہن کر، ہرچند کہ وہ بھی جوانی کی سرحد پار کرنے کی فکر میں تھیں۔ لیکن بعد میں تو سال بسال اور زیادہ سال خوردہ اور میل خوری عفیفاؤں سے سابقہ پڑا۔ اُترا ہوا سِن، اللہ اللہ کرنے کے دن۔ یوں لگتا ہے جیسے گیشاؤں کی اب باقیات الصالحات ہی رہ گئی ہوں۔ کئی لڑکیاں اِس پیشے میں کمانے کو آتی ہیں۔ دو برس چار برس کما کر شادی کرکے اِس سے کنارہ کرتی ہیں۔ پہلے کیوٹو کی تعلیم گاہوں میں گیشا بننے کا فن سیکھنے میں لڑکیاں کئی کئی برس لگاتی تھیں۔ اب کسے اِس کی فرصت۔ اب اِس کو سیاحوں کی دلچسپی کی چیز زیادہ کہئے۔ ٹورسٹوں کے لیے تو یوں بھی ہر کام چالو قسم کا ہوتا ہے۔ مشرق و مغرب سے طرح طرح کے لوگ آتے ہیں۔ بسوں میں سوار آئے، جوتے اُتار کر آدھ گھنٹہ بیٹھے، چائے اور ساکی پی، کُچھ ٹھونگا، کُچھ طنبورہ

سُنا اور جوتے پہن سلام دُعا کرتے چلتے بنے۔ جن لوگوں نے فلم THE AUGUST MOON TEA HOUSE دیکھی ہے اور امریکی پردیسی فوجیوں اور کومل کومل جاپانی لڑکیوں کے معاشقے دیکھے ہیں۔ اُن کو یہ سُن کر مایوسی ہو گی کہ اب وہ زمانہ لد گیا ہے۔ امریکی لد گئے تو زمانے کو بھی اپنے ساتھ لے گئے۔ ہاں وضع دار جاپانی، بالعموم ڈھلتی عمر کے خوشحال جاپانی ضرور اب بھی شام کو دِل بہلاوے کے لئے اِدھر آ نکلتے ہیں۔ زیادہ تر ایسے ہیں کہ غیر مُلکی مہمانوں کو شاد کام کرنا مقصود ہو۔ اگر جاپانی قوم تہذیبی طور پر اتنی وضع دار نہ ہوتی تو یہ کارخانے کب کے اُٹھ بھی گئے ہوتے۔ اور باتیں اپنی جگہ تازہ خون کی کمی اِن گیشا گھروں میں زیادہ محسوس ہوتی ہے۔ اب یہ تازہ خون باروں یعنی شراب خانوں کی میزبان لڑکیوں میں البتہ نظر آتا ہے، جہاں زندگی کی رفتار کہیں تیز اور اندازِ دِلرُبائی کہیں جارحانہ ہے۔ یہاں جتنا گُڑ ڈالو اُتنا میٹھا کا حساب ہے۔ نظرِ خوش گزرے سے منزلِ مراد تک کا فاصلہ آپ کی جیب پر منحصر ہے۔ ویسے جاپان کی کیا تخصیص ہے، یہ بات تو اور جگہوں کے لئے بھی سچ ہے۔

ہمارا سفارت خانہ اب پہلی جگہ سے اُٹھ کر نئی جگہ پر آ گیا ہے۔ ٹوکیو ٹاور کے نواح میں۔ جگہ بہتر، کشادہ، باوقار۔ سلطان محمد خاں ہمارے سفیر، ہمارے سینئر ترین

ڈپلومیٹوں میں سے ہیں۔ فارن سیکر ٹیری بھی رہے ہیں۔ چین میں سفیر بھی تھے۔ کسنگر صاحب کے چین جانے کے قصّے میں اُن کا بہت ڈرامائی پارٹ رہا ہے۔ نکتہ رس اور بذلہ سنج۔ گھر سے رجواڑے ہیں۔ لہٰذا اپنی تہذیبی روایات ساتھ لیے پھرتے ہیں۔ ٹوکیو میں ایک روز ضرور ہمیں نوازتے ہیں۔ کھانے پر بُلاتے ہیں۔ سفیر کا مکان پاکستان کا اپنا ہے۔ سفارت خانہ کرائے کا ہے۔ ہم نے کہا خان صاحب پاکستان نے اتنے دِنوں سے زمین خرید رکھی ہے۔ کیوں نہیں آپ اپنی عمارت بنا لیتے۔ وہ تو چُپ رہے۔ ایک دوسرے صاحب نے بتایا کہ مظہر حسین صاحب جب یہاں سفیر تھے، انہوں نے بہت بار لکھا۔ سستے میں بن رہا تھا لیکن اے جی پی آر قسم کی چیز سب کے ساتھ لگی رہتی ہے کہ اشرفیاں لُٹیں، کوئلوں پہ مہر۔ کرایہ دینا منظور، بلڈنگ بنانا نا منظور۔ اور وہ کرایہ دو سال میں بلڈنگ بنانے کے خرچ سے بڑھ جاتا ہے۔ ہم نے سلطان محمد خاں صاحب سے گزارش کی کہ دفترِ خارجہ پر زور دیں۔ اب وہاں زیادہ سمجھ دار لوگ آ گئے ہیں۔ مُسکرا کر فرمایا "دوں گا" زور کس لفظ پر۔ زور پر۔۔۔

جاپان میں خوش کے سارے مرکّب موجود ہیں۔ خوش باشی، خوش روئی، خوش خلقی، خوش سلیقگی وغیرہ۔ اِس کے ہم اور زیادہ معتقد ہوئے جب بنکاک ائیر پورٹ

پر تھائی بیبیوں کی خشونت سے پالا پڑا۔ اور ہاں خوب صورتی۔ مناظر کی خوبصورتی کے اعتبار سے بھی ہم نے کوئی ملک ایسانہ دیکھا۔ خود ہمارے سفیر صاحب نے فرمایا کہ میں جاپان میں کوئی خوش منظر جگہ دیکھتا ہوں تو کہتا ہوں۔ بھلا اِس سے زیادہ خوب صورت بھی کوئی مقام ہو سکتا ہے؟ اگلی بار اِس سے بھی زیادہ دِلرُبا منظر دیکھنے کو ملتا ہے۔ خود ہمارے ساتھ یہ ہوا ہم بڑے شہروں ٹوکیو، اوساکا، نارا، کیوٹو کے علاوہ نکّو، ہاکونے، ناسو وغیرہ دیکھ چکے ہیں۔ نکّو کے کیا کہنے اور ٹوبہ تو ہمیں بہت ہی پسند آیا کہ موتیوں کی خلیج میں خود ایک موتی ہے۔ اب کے ہمارے میزبان ہمیں بعبُورِ خلیج ٹوکیو ایک اور جگہ پر لے گئے جہاں ہم نے ایک شب گزاری لیکن نام اِس مقام کا ہمیں یاد نہ ہوا۔ پروگرام یہ تھا کہ ایکسپریس ٹرین سے تائی یاما اسٹیشن پہنچیں۔ وہاں سے ہی سادرا گرینڈ ہوٹل بس سے۔ وہاں ساکی یُو کی ڈنر کھائیں اور اگلے روز پھر تائی یاما اسٹیشن بس سے، اور ہاما کنایا اسٹیشن ریل سے اور پھر کنایا سے فیری بوٹ میں یعنی بیڑی میں کوری ہا، پورٹ پر۔ وہاں بس میں کاماکورا کے نواح کی سیر دیکھتے۔ کاماکورا خاص۔ وہاں لنچ کھا کر ساحل کے ساتھ ساتھ، کاماکورا پہاڑی کی بغل سے گزرتے ہوئے گریٹ بُدھا یعنی بُدھ عظیم، وہاں سے پھر کاماکورا اسٹیشن کے راستے ٹوکیو واپس۔

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔ جاتے میں خبر لگی کہ بارش سے ریل کی پٹڑی پر چٹّان گِر گئی لہٰذا ریل کا سفر متروک۔ ٹوکیو کی نواحی بندرگاہ کوہاماہی سے فیری میں سوار ہو جیے۔ یہ سفر خاصا طویل اور بہت مزے کا تھا۔ ہنستے گاتے دوسرے کنارے پر لگے۔ ہماری بس بھی اِس بیڑی میں سوار تھی۔ اِس میں سوار آگے چلے، ساحل کے ساتھ ساتھ سمندر اور سبزے کی بہار دیکھتے۔ ہوٹل وہی جو پروگرام میں لکھا تھا لیکن اندھیرا ہو گیا تھا۔ آٹھ بجے شب کے اور تھوڑی بارش۔ ساکی یو کی ڈنر میں آپ کے سامنے چوکی پر چولہار کھ دیا جاتا ہے اور اس پہ کڑھائی اور ایک طرف گوشت سبزی وغیرہ. جو جو جی چاہے تلئے؟ جو جی چاہے کھایئے۔ ہمارے لیے ہمارے میزبانوں نے ایک مختصر ساڈرامہ بھی کھیلا۔ کسی کی مُونچھ گِر جاتی تھی، کسی کی داڑھی، کسی کی تلوار میان میں سے خود بخود نکل آتی تھی۔ یہاں وہ تالاب بھی تھا جس میں سب ننگے نہاتے ہیں لیکن کسی نے اُدھر کا رُخ نہ کیا۔ اگلی صبح دیکھا کہ ہم کہاں ہیں۔ ایسا منظر ہم نے زندگی بھر نہ دیکھا تھا۔ ہوٹل اونچائی پر تھا۔ آگے سبزے کے تختے اور پام کے درخت سلیقے سے قطار در قطار لگے۔ ترشح اور تین چار فرلانگ اِدھر بحر الکاہل ٹھاٹھیں مارتا ہوا۔۔۔ پھر ایک بار محبوب خزاں کا مصرعہ زبان پر آیا۔

اتنا حُسن کیا کرو گے

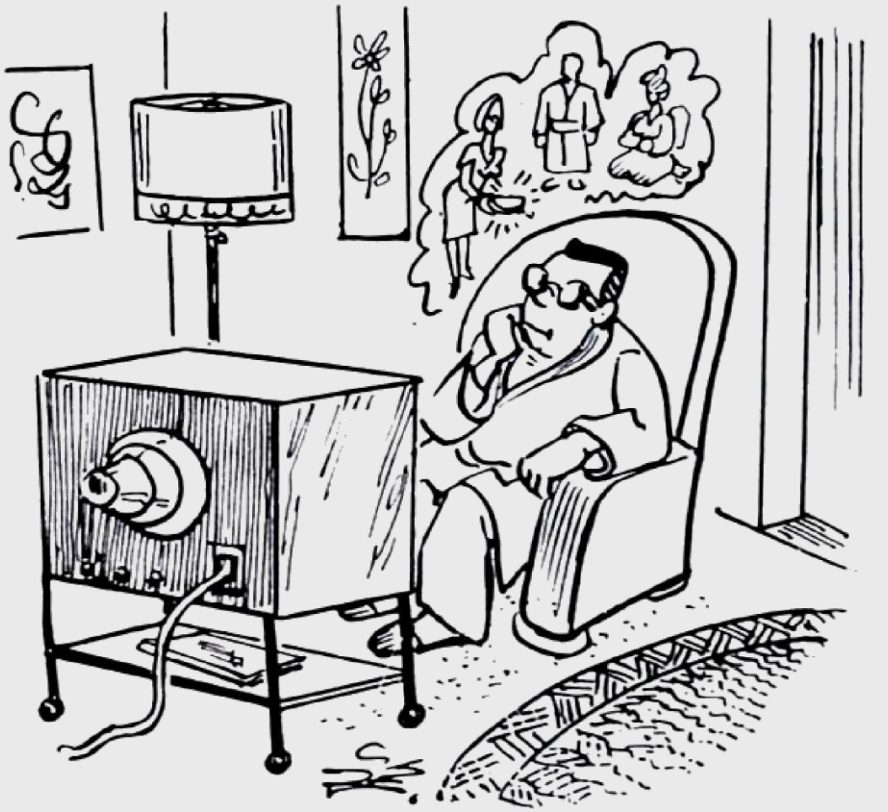
اتنا حُسن کیا کرو گے

لو آج کی شب بھی سو چکے ہم

اس وقت رات کے ساڑھے بارہ بجے ہیں اور نیند کسی صورت نہیں آ رہی ہے۔ دیار دُور ہے اور کلبۂ احزاں ہے۔ آسان اُردُو میں حجرہ کہیئے، لیکن مسجد یا خانقاہ کا نہیں، ہوٹل کا۔ سائز ۵ فٹ ۱۲ فٹ ہو گا۔ کوئی وجہ نیند نہ آنے کی ایسی نہیں ہے کہ بیان کیجئے یا چھپایئے۔ آخر اپنے پڑھنے والوں سے کیا پردہ۔ ٹوکیو میں سردی ایسی شدید کہ صُبح نکلے ہے کانپتا خورشید، کمرہ گرم ہو گیا تھا۔ لہٰذا ایسی حرکت کی کہ کوئی نہ کرے گا یعنی کمرے کی عقبی کھڑکی پہلے تھوڑی، پھر زیادہ کھول دی۔ غنیمت ہے کہ یہ کھڑکی

کھلنے والی ہے۔ ورنہ بند شیشہ ہوتا ہے۔ سرد زمہریری ہوا کا جھونکا آیا۔ طبیعت میں تراوٹ بھی تھوڑی سی آئی، نیند پھر بھی نہ آئی۔ ٹیلیویژن کھولا، کوئی جاسوسی فلم ہو رہی ہے۔ زبان تو سمجھ میں نہیں آرہی لیکن چہرے پہچانے جارہے ہیں۔ وہی لوگ ہیں جو ایڈونچر وغیرہ میں ہوتے ہیں، ہمارے ہیرو کہیں پھنسے ہوئے ہیں اور دُشمن کے راز چُرا رہے ہیں، برقی برمے سے چھت میں سوراخ کر رہے ہیں۔ ایلو نامراد ولین آ پہنچا۔ اب خیر نہیں لیکن ہمارا ہیرو بھی حرفوں کا بنا ہوا ہے۔ چھت کی سلاخوں سے چمٹ گیا ہے۔ خیریت ہے کہ یہ فلم ہے ورنہ فوراً پکڑا جاتا اور کیفرِ کردار کو پہنچتا۔ فلم کے برخلاف زندگی میں ولین اتنے اندھے نہیں ہوتے کہ ایک نظر چھت پر نہ ڈالیں۔ ایلو، ہمارا ہیرو راہِ فرار اختیار کر گیا اور لو اب فلم بھی ختم ہو گئی۔ اب نیند لانے کی کیا ترکیب ہو۔ سفر نامہ لکھتے ہیں۔ لوگ آج کل سفر ناموں سے ایسے عاجز آ گئے ہیں کہ سفر ناموں کی شکل دیکھ کر بلکہ نام ہی سن کر خرّاٹے لینے لگتے ہیں۔ سفر نامہ لکھنا تو اس سے بھی زیادہ۔۔۔ لو اِدھر ٹیلیویژن پر ایک اور فلم شروع ہو گئی۔ ایک جاپانی بی بی پیٹھ پر گدّی باندھے اکڑوں بیٹھی کُچھ فرمارہی ہے۔ یہ سامنے والے آدمی نے ایک لمبا چوغہ نما کُرتا پہن رکھا ہے جیسا دمِ تحریر ہم نے پہن رکھا ہے اور جاپانی ہوٹلوں میں شب خوابی کے لئے ملتا ہے۔ اِس میں پاجامہ

وغیرہ نہیں ہوتا، نہ بٹن ہوتے ہیں۔ سامنے سے پورا کھُلا۔ بس پیٹ پہ پیٹی سی باندھ لیجئے۔ لو وہ بھی ختم ہو گئی۔ شاید ٹریلر تھا۔ اب کوئی اشتہار ہے۔ کسی مکھّن کا ہے۔ کیا عمدہ کباب تلے جا رہے ہیں۔ ہمارے منہ میں پانی بھر آیا ہے۔ کوئی اِن سے پوچھے رات کے پونے ایک بجے تمہارا مکھّن خریدنے کو کون جاگ رہا ہو گا۔ بے شک ہم



ٹی وی پر اشتہار

جاگ ہے ہیں۔ لیکن ہمیں مکھّن نہیں چاہیے۔ ہمارے اپنے ملک میں ہماری ضرورت کا کافی ہوتا ہے۔ کھانے کے لیے بھی، لگانے کے لئے بھی۔ کمرہ کھڑکی کھلے ہونے کے باوجود گرم ہے اور نیند بالکل غائب ہے۔ ہمارے ہم چشم تو سوچ رہے ہوں گے کہ یہ شخص مکر کر رہاہے۔ گیشاؤں کے جلو میں بیٹھا ساکی نوشِ جان کر رہا ہو گا لیکن یہ بات نہیں ہے۔ اوپر جو کُچھ بیان کیا ہے سچ ہے۔ پورا سچ ہے۔ اور سچ کے علاوہ کُچھ نہیں ہے۔

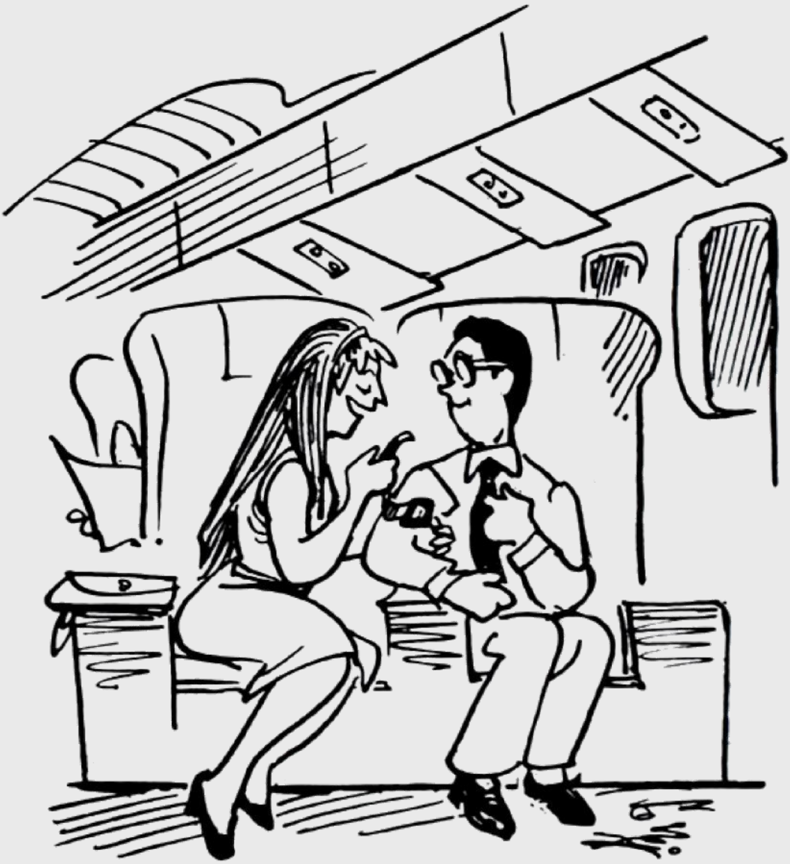
اب سفر پر روانہ ہوتے وقت جی میں ایسے ایسے خیال آتے ہیں کہ پہلے نہیں آیا کرتے تھے۔ گھر کے دروازے پر نظر ڈالتے ہیں تو کھٹکا ہوتا ہے کہ واپسی ہوتی ہے کہ نہیں ہوتی ہے۔ یہ ہماری اپنی پی آئی اے کا بڑا اجغادری جہاز ڈی سی ۱۰ تھا۔ پہلے ہم نے پان امریکن اور لفتانزا وغیرہ کے جمبو جہازوں سے سفر کیا ہے تو عموماً ایک مسافر کے حصّہ میں چھ چھ سیٹیں آئی تھیں۔ آرام سے استراحت کرتے جایئے۔ لیکن یہ قریب قریب بھرا ہوا تھا۔ وجہ یہ معلوم ہوئی کہ فلپائنی حاجی منیلا واپس جا رہے ہیں۔ جدّہ سے کراچی اور کراچی سے منیلا۔ ہر چند کہ اُن کی اپنی کمپنی کا کرایہ کوئی پانچ سو روپے کم ہوتا ہے لیکن یہ مسلمان اسلامی جذبے کے تحت پی آئی اے میں سفر کرتے ہیں۔ کئی کئی سو آدمیوں کی ٹولی۔ اچھّا ہے کہ یہ لوگ ہمارے ٹی وی پر

کلچر کی بحثیں نہیں سُنتے اور راجہ داہر اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کو نہیں جانتے ورنہ پی آئی اے کا نقصان ہو جاتا۔ ایک بزرگ نے ہمارا اتا پتہ دریافت کرنا شروع کیا۔ جی میں تو آیا کہ کہیں کہ پنجابی ہیں اور پنجاب کی بڑی روایات ہیں اور مہاراجہ پورس ہمارا ہی آدمی تھا جس نے سکندرِ اعظم کے دانت کھٹّے کیے تھے۔ اِن بزرگ نے اتنی تاریخ تھوڑی پڑھی ہو گی کہ تردید کرتے کُچھ وارث شاہ کیدو اور چوچک وغیرہ کا ذکر کرنے کو بھی جی چاہا۔ لیکن پی گئے، خُدا کا خوف کیا۔ اپنے کو پاکستانی بتا کر چُپ ہو گئے۔ واپسی پر کوئی روشن خیال جواب طلب کرے گا تو آئیں بائیں شائیں کر لیں گے۔

گھر والوں نے ہمارے بازو پر جو امام ضامن باندھا تھا وہ کھسک کر نیچے آ گیا تھا۔ ایک ہاتھ سے ہم نے اُس کی گِرہ کھول تو لی لیکن ایک ماہ سے اور دوبارہ باندھنے میں مشکل پیش آ رہی تھی۔ ایک بی بی خاصی چندے آفتاب چندے ماہتاب دو سیٹیں اُدھر بیٹھی کنکھیوں سے دیکھ رہی تھیں۔ مُسکرائیں اور بولیں میں مدد کر سکتی ہوں؟ ہم نے جی میں کہا کہ بی بی کہاں تک ہماری مدد کرو گی۔ ہم تو مدد کے بہت محتاج ہیں لیکن بظاہر یہی کہا کہ نیکی اور پوچھ پوچھ۔ اِسے بندھوانے میں ہم نے خاصا وقت لیا۔ کبھی ڈھیلا رہتا تھا کبھی بھنچ جاتا تھا۔ پوچھنے لگیں۔ یہ ہے کیا؟ ہم نے بتایا کہ امام ضامن

ہے۔اِس کا پورا فلسفہ بیان کیا کہ سفر میں جاتے ہوئے بند ھواتے ہیں۔ آدمی محفوظ رہتا ہے۔ ہمارے پاس دو ہیں۔ کہو تو تمہارے باندھ دیں؟ یہ سیٹ ساتھ کی خالی ہے۔ ٹک اِس پہ بیٹھ جاؤ۔ لیکن یہ لوگ بد عقیدہ ہوتے ہیں، اِسی لیے تو شاعر اِن کو بُت وغیرہ کہتے ہیں۔ اُلٹا بحث کرنے لگیں کہ کیا آج تک کوئی امام ضامن بند ھوانے والا کسی گُزند کا شکار نہیں ہوا۔ فرانسیسی یا اسپینی تھیں۔ کسی ائیر لائن کی ہوسٹس، امام ضامن بند ھوائے بغیر سفر کرنے کی عادی ہوں گی۔ کسی روز خطا کھائیں گے۔ ہمارا امام ضامن تھوڑی دیر بعد پھر کھسکا۔ ایسے معلوم ہوتا تھا ہمارے بازو پر نہیں ہمارے ایمان کے ساتھ بندھا ہوا ہے۔ ہم نے پھر اُس بی بی کی طرف پُر اُمّید نگاہوں سے دیکھا، لیکن یہ لوگ سنگ دِل ہوتے ہیں۔ بنکاک کے اُدھر عین سمندر پر ہوں گے کہ اعلان ہوا۔ حفاظتی بند باندھ لیجئے۔ جھٹکے لگنے شروع ہو گئے تھے۔ طوفانی موسم ہے۔ سندباد کی کہانیوں میں تو ایسے موقع پر جہاز کے ناخدا سر کے بالوں کو نوچا کرتے تھے۔ یکایک جہاز کئی سو فٹ نیچے گِرا۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ اب گئے۔ باورچی خانے کی سب چیزیں جھنجھناتی نیچے گِر گئیں۔ عورتوں کی چیخیں نکل گئیں۔ ہمارے کُچھ ہاتھ پاؤں تو پھولے اور پسینے بھی چھوٹے اور دِل بھی ڈوبا، لیکن اِس سے زیادہ ہم پر کُچھ اثر نہ ہوا۔ ہمارے پائے ثبات میں لغزش نہ آئی۔ اِسے امام ضامن کا اثر کہنا

چاہیے۔



امام ضامن بندھوایا

ہمارے گھر والوں نے اب کے بھی سوا روپیہ باندھنا چاہا ہم نے ٹوکا کہ کُچھ مہنگائی کا خیال کرو۔ پرانے ریٹ پر باندھے جارہے ہو۔ پانچ روپے بندھوائے۔ ہمارے

خیال میں یہ اچھا ہوا۔ اتنے سارے بد عقیدہ ہم سفروں کی سلامتی کی ذمّہ داری بھی تو ہمیں پر عائد ہوتی ہے۔

ان بڑے جہازوں میں فلم بھی دکھاتے ہیں۔ تصویر دیکھنی ہو تو مت دیکھیے لیکن اگر آواز بھی سُننی ہے تو دو ڈالر دیجیے اور سُننے کی ٹوٹنی لیجئے۔ آج تھری مسکٹیئر تھی یعنی تین بندوقچی، چارلس ہسٹن وغیرہ تلوار کے جوہر دکھا رہے تھے۔ بلکہ تلوار ہی زیادہ چلی بندوق کم ہی نظر آئی۔ ہم نے دو ڈالر خرچ کرنا پسند کیا۔ ایک تو اِس لئے کہ ملک کا زرِ مبادلہ بچے۔ زرِ مبادلہ بچا کر ہم اپنے ملک میں صنعتیں قائم کر سکتے ہیں۔ دوسرے اِس لیے کہ قارئین کرام انگریزی اور امریکی فلموں کے مکالمے جس طرح آپ کی سمجھ میں نہیں آتے۔ ہماری سمجھ میں بھی نہیں آتے۔ یہ الگ بات ہے کہ نہ آپ اعتراف کرتے ہیں نہ ہم۔ کوئی بچّہ پوچھے کہ ابّو جی اِس شخص نے کیا کہا تو ڈانٹ کر بِٹھا دیتے ہیں کہ ٹر ٹر مت کرو، فلم دیکھ۔ انگریزی تو ہم بخوبی جانتے ہیں۔ شیکسپیئر وغیرہ۔ لیکن اِن انگریزوں امریکیوں کو بولنی نہیں آتی۔ بلکہ جب ہم بولتے ہیں تو یہ پوری طرح سمجھ بھی نہیں پاتے۔

بنکاک میں نیم شب کو ٹھیکی لے کر منیلا کے قریب پُہنچے تو صُبح ہو رہی تھی۔ اتنی اونچائی سے صُبح کی طباشیر، ہم نے پہلی بار دیکھی۔ اچھّا سپیدۂ سحری اِسے کہتے ہیں۔

منیلا جہاز سے بہت خوبصورت نظر آتا ہے۔ بارش ہو چکی تھی۔ ترشح اب بھی ہو رہا تھا۔ بلکہ بھلا لگتا تھا۔ جہاز سے ٹرانزٹ روم تک پیدل گئے اور برساتی استعمال نہ کی۔

منیلا میں ہمارے دوست ہیں لیکن یہ وقت ایسا نہ تھا کہ کسی کو آنے کی زحمت دیتے۔ یہاں کا ائیرپورٹ معمولی ہے۔ کوئی دِلکشی نہیں رکھتا۔ موسم بھی کُچھ گرم تھا۔ یہاں اخبار دستیاب ہوا۔ بلیٹن اِس کا نام ہے۔ فلپائن کے نیشنل پریس ٹرسٹ کا اخبار ہے۔ اِس سے زیادہ تعریف فضول ہے۔ ہائے کیا کیا بھرپورا اخبار نکلا کرتے تھے یہاں سے۔ اب چار سال مارشل لاء ہے۔ آج کے اخبار کی سُرخی میں خوشخبری تھی کہ مارشل لاء تو خیر نہیں، کرفیو اُٹھالیا گیا ہے، دو ہفتہ کے لیے، کرسمس کی وجہ سے۔ آگے بڑھا تو لکھا تھا کہ ماسوائے اُن علاقوں کے جہاں امن و امان کی حالت کرفیو اُٹھانے کی اجازت نہیں دیتی۔ ہمارے قارئین جانتے ہیں کہ ایسے موقع پر حالات سے اجازت لینی پڑتی ہے۔ آج کل ملک میں نیم شب سے ۴ بجے صُبح تک کا کرفیو تھا۔ اِس خوشخبری پر اور حکومت کی سیر چشمی پر اُستاد ذوق زندہ ہوتے تو تہنیت کا قصیدہ لکھتے۔ خیر اخباروں والے ایڈیٹوریل تو لکھیں گے ہی کہ آج کا اُستاد ذوق نثر میں وہی مضمون باندھتا ہے۔

کچھ احوال ٹوکیو کا

ٹوکیو میں اُن دنوں کڑاکے کی سردی تھی۔ اوور کوٹ کی، برف بھی دیکھی لیکن ٹوکیو میں نہیں، ٹوکیو سے دو سو میل دور ماؤنٹ فیوجی کے دامن میں۔ دامنِ کوہ میں ایک لمبی چوڑی جھیل کو جھانکتا ہوا ایک ڈھنڈار ہوٹل ہے۔ ہوٹل ماؤنٹ فیوجی، ایک شب ہماری وہاں بسر ہوئی۔ ماؤنٹ فیوجی یا فیوجی یاما جاپان والوں کی روح ہے، جاپانیوں کے لیے تیرتھ کا درجہ رکھتی ہے۔ جس نے اِسے نہیں دیکھا اُس کی نجات نہیں۔ لوگ ذوق وشوق سے اسکی چوٹی کا نظّارہ کرنے اور نجات پانے کے لیے آتے

ہیں۔ اکثر اوقات یہ چوٹی بادلوں میں اور دھند میں لپٹی رہتی ہے لیکن جس روز ہم گئے خوب چمکیلی دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ جس طرح ہندوستان کے آدھی چیزوں کے نام تاج محل کے نام پر ہیں۔ تاج محل بیڑی، تاج محل چپل، تاج محل لٹھّا، تاج محل مکھّن، تاج محل کھاد اور تاج محل جھاڑو وغیرہ۔ اِسی طرح جاپان میں فیوجی کیمرہ، فیوجی بینک سے لے کر نجانے کیا کیا فیوجی مل جائے گا۔ جاپان سے کوئی تصویر یا پینٹنگ آپ کو لانی ہو تو فیوجی کے علاوہ شاید ہی کسی اور منظر کی ملے۔ یہاں کے لوگوں کو اسکیٹنگ یعنی برف پر پھسلنے اور دوڑنے کا بہت شوق ہے جسے دیکھو لمبے جوتے پہنے، جھالر دار ٹوپی زیبِ سر کئے اونچی بنا پہاڑ کی طرف بھاگا جارہا ہے۔ تو چل میں آیا۔ لیکن میاں آزاد تُرا چہ تُجھے کیا۔

بہارِ بے سپر جام و یار گُزرے ہے

نیسم تیر سی سینے کے پار گزرے ہے

ٹوکیو جاتے ہی ہمارے لیے کھانے کا مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے۔ یا یوں کہیئے کہ ہم اپنے لیے پیدا کر لیتے ہیں۔ جاپانی ہم نہیں سمجھتے اور اُردوئے مُعلّیٰ جاپانیوں کی سمجھ میں نہیں آتی۔ ہماری انگریزی بھی اکثر کے لیے اُردوئے مُعلّیٰ ہی ہے۔ ایک جاپانی کے

ہاں جو دُکاندار ہے ہمیں ہر پھیرے میں جانا پڑتا ہے۔ ابھی تک وہ یس اور نو سے آگے نہیں بڑھا۔ اچھّے خاصے تعلیم یافتہ لوگ اعداد کے انگریزی نام تک نہیں سمجھتے۔ بعض تو انگلیاں اور پنجہ دیکھا کر بات کرتے ہیں۔ چڑیا گھر کی سیر میں ہمیں غبارے خریدنے کا شوق ہوا۔ قیمت پوچھی تو پانچ انگلیاں، ہم نے فرض کر لیا کہ پچاس ین کہہ رہا ہے۔ ڈیڑھ روپیہ ہمارے ہاں۔ وہ غبارہ اٹھنّی کا ہو گا، بارہ آنے کا ہو گا، بہر حال ڈیڑھ روپے زیادہ نہ معلوم ہوا۔ جب بند ھوائے اور پیسے دیے تو معلوم ہوا پانچسوی مراد تھی۔ پندرہ روپے۔ ہم نے کہا نا صاحب شکریہ۔ آری گاتو کزائی مش۔ لیکن ذکر کھانے کا تھا۔ دعوتوں میں ہم پہلے سے کہہ دیتے تھے کہ فلاں شے ہمارے لیے حرام ہے۔ لیکن ہمارے دوست کے ساتھ یہ ماجرا گزرا کہ انہوں نے زور دے کر کہا۔ نو پورک۔ یعنی پورک نہیں چاہیے اور جو جی چاہے لے آئے۔ وہ سمجھا خاص طور پر پورک کی فرمائش ہے۔ چنانچہ وہی لایا۔ یورپ کی طرح یہاں بھی ہمارا مدار مُرغ و ماہی پر رہتا ہے لیکن مُرغ و ماہی کسی کو سمجھایئے تو کیسے سمجھائے۔ پہلے ہی دِن ہم اور ملائشیا کے نور اعظم کھانے کی تلاش میں نکلے۔ ریستوران میں ہر کھانے کی ایک پلیٹ نمونۃً شیشے کے کیس میں دھری رہتی ہے۔ مع قیمت کے۔ آپ اشارہ کیجئے؟ بیرا وہی ڈِش دے گا۔ یوں پیرس میں بھی ساں شال کے طعام

خانوں میں یہی رسم ہے۔ لیکن جاپان میں یہ نمائشی ڈش اصلی نہیں ہوتی۔ پلاسٹک کی ہوتی ہے لیکن معلوم یہی ہوتا ہے کہ اصلی ہے۔ یہ بھی سُنا ہے کہ نیچے اصل کھانا ہوتا ہے اُس پر پلاسٹک کی تہہ جما دیتے ہیں۔ ہم زیادہ تحقیق نہ کر سکے۔ یہاں بھی دھوکا ہوتا ہے، ایک چیز کو ہم مچھلی سمجھے تھے۔ فی الاصل کُچھ اور تھی۔ ایک دو کافی ہاؤسوں میں قسمت آزمائی کی جب شُبہ دُور نہ ہوا تو ناچار اجنتا کا رُخ کیا، یہ ایک ہندوستانی ریستوران ہے۔ کسی جنوبی ہند والے کا۔ وہاں چکن رائس مل جاتا ہے اور چپاتی مل جاتی ہے۔ چپاتی کے اوپر پیپر ویٹ رکھنا پڑتا ہے ورنہ اُڑ جاتی ہے۔ عملہ یہاں بھی سارا جاپانی ہے لیکن اُن کی شباہت اور پوشش سے تذکیر و تانیث کا کُچھ پتہ نہیں چلتا۔ سمجھ میں نہیں آتا بیرے کو مس کہہ کر بلائیں یا مسٹر۔ یہ ریستوران کُچھ بہت اُونچے درجے کا نہیں، اشوکا کی ٹکّر کا نہیں، بس گزارا ہے۔ دوسری بار ہم یہاں بھی نہ گئے۔ گرانڈ ہوٹل کے سامنے ایک بُڑھیا کی بیکری ہے اُس میں چیزیں روٹیاں، میٹھی روٹیاں، سینڈوچ وغیرہ عمدہ اور سستے ملتے ہیں۔ ساتھ دُودھ کی بوتل لے لیجیئے۔ ہمارے تجربے میں سب سے اچھّا کھانا یہی رہتا ہے۔ آپ روغنیات سے محفوظ بھی رہتے ہیں۔ پاس کی دُکان سے پھل بھی لے لیجیئے۔ سیب اتنا بڑا کہ ہم نے اپنے مُلک میں یا یورپ میں نہیں دیکھا۔ سنگترے کیلے کچھ یہاں کے، کچھ باہر کے۔

سب وے یعنی انڈر گراؤنڈ گاڑی کا سفر سب سے اچھّا، آرام دہ اور سستا رہتا ہے۔ جو مسافت کار میں ڈیڑھ گھنٹے میں طے ہوتی ہے، ٹریفک، یک طرفہ راستوں اور لال سبز بتّیوں کی وجہ سے، یہاں دس پندرہ منٹ کی راہ ہے۔ سردی سے بھی بچتے ہیں۔ اِن گاڑیوں کے دروازے چلتے وقت خود بخود بند ہوتے ہیں، اگر کوئی چیز دروازوں کے بیچ میں آجائے اور دروازہ بند نہ ہو سکے تو گاڑی بھی نہیں چل سکتی۔ ٹیکسیوں میں بھی یہی انتظام ہے کہ ڈرائیور یا مسافر کو تکلیف نہیں کرنی پڑتی۔ ڈرائیور بٹن دباتا ہے تو گاڑی کے دروازے کھُل جاتے ہیں اور بند ہو جاتے ہیں۔ بلکہ ڈگی کو کھولنے بند کرنے کے لیے بھی بٹن دباتے ہیں۔ سردار امان اللہ اپنی کار کسی جگہ پارک کر کے کسی دُکان یا بازار میں جاتے تھے تو ہم اُس کے شیشے چڑھا کر دروازہ لاک کرنے لگتے تھے۔ وہ ہنستے کہ یہ کراچی کی عادت ہے اُس سے مجبور ہو۔ یہاں اِس تکلّف کی حاجت نہیں۔ آپ کی گاڑی کوئی اُٹھا کر نہ لے جائے گا۔ جس کی وجہ جاپانیوں کی ایمانداری کے علاوہ یہ بھی ہے کہ یہاں سیکنڈ ہینڈ کار ہزار دو ہزار روپے میں آجاتی ہے اور اچھّی خاصی۔ یہ میری شان دار مارک ۲ کار یہاں کے حساب سے چار ہزار روپے کی جانو۔ ہم نے کہا یہ بات ہے تو ہمارے ملک میں ہی سیکنڈ ہینڈ کاریں کیوں در آمد نہیں کی جاتیں۔ زرِّ مبادلہ بچتا۔ آخر پُرانے کوٹ ہم منگواتے ہی ہیں اور نئی کار

بھی تو دو دن میں سیکنڈ ہینڈ ہو ہی جاتی ہے۔ امان اللہ تو چُپ رہے لیکن ہم پوچھتے ہی کیوں صاحب مفت کے داموں یہ کاریں ملتی ہیں تو کیوں نہیں یہاں منگا کر لوگوں کو دس دس ہزار روپے میں دی جائیں تاکہ متوسّط طبقے کے مسائل حل ہوں۔ ہاں اِس سے کس کے مفاد پر زد پڑتی ہے تو اور بات ہے۔ ٹیکسی کا کرایہ ابھی چار سال تک ایک سو ستّرین تھا۔ یہ کرایہ۔۔۔ پہلے دو کلومیٹر کا ہے۔ پھر ۲۲۰ ہوا، اب ۲۸۰ ین ہے۔ کوئی ساڑھے آٹھ روپے۔ ائیر پورٹ سے ہمارے ہوٹل تک کوئی نوّے روپے بنتے ہیں۔ کفایت مطلوب ہو تو مونوریل سے سفر کیجئے۔ ایک مونوریل شہر اور ائیر پورٹ کے درمیان دوڑتی ہے۔ کرایہ اُس کا صرف ۲۳۰ ین ہے۔ البتّہ ایک خاص اسٹیشن ہی سے اِسے پکڑ سکتے ہیں۔ سو سب وے میں وہاں تک پہنچنا بھی کیا مُشکل ہے۔

سب سے بڑی خوبی یہاں یہ ہے کہ بخشش کی رسم نہیں۔ نہ ہوٹل میں نہ ریستوران میں۔ نہ ائیر پورٹ پر۔ بے شک چین میں بھی بخشش نہیں لیکن چین کا نظام ہی اور ہے۔ ہم سمجھتے ہیں بخشش نفس کی تذلیل ہے اور دینے والے کو الگ تکلیف ہوتی ہے۔ اِس کا رواج یورپ اور امریکہ میں سبھی جگہ ہے۔ بلکہ ولایت میں تو یہ دیکھا کہ دھونس دے کر سینے پر سوار ہو کر لی جاتی ہے۔ اِسے Tip کہتے ہیں۔ ہمارے ہاں ان

ہوٹلوں میں بھی بیروں کو دینی ہی پڑتی ہے جہاں ۱۵ فیصدی سروس چارج بِل میں لگا رہتا ہے۔ میرے جیسی شکل بنا کر کہتے ہیں، صاحب وہ تو مالک رکھ لیتے ہیں ہمیں کہاں ملتی ہیں۔ انٹر کانٹی نینٹل ہوٹلوں میں سبھی بیرے پڑھے لکھے ہیں، بعضے گریجویٹ بھی۔ یہاں بھی شروع میں ٹِپ کا رواج نہ تھا۔ سروس چارج جو لگتا ہے لیکن اب دیکھا ہے کہ دینے والے دیتے ہیں اور لینے والے تھینک یو کہہ کر لیتے ہیں۔ ٹوکیو سے چل کر ہم منیلا کے ہوائی اڈّے پر رُکے۔ ٹائلٹ میں گئے بڑے کام کے لئے نہیں چھوٹے کام کے لئے۔ ہماری گردن پر گُدگُدی سی ہوئی۔ دیکھا کہ ایک شخص بُرش سے ہمارے کالر سے مٹّی جھاڑ رہا ہے جو وہاں موجود نہ تھی، پھر اُس نے کاغذ کی ایک دھجی لے کر ہمارے پاؤں پر پوچی مارنی چاہی۔ ہم نے پاؤں پیچھے کھینچ لئے۔ پھر بھی اُس نے دانت نکال کر ہاتھ آگے پھیلا ہی دیے کہ دے جا خُدا کے نام پر بابا ہمّت ہے گر دینے کی؟



لوٹا لے کر ٹائلٹ کی طرف

مسافر نوازوں کی تلاش میں

سفر ہمارے لیے کوئی نئی بات نہیں ہے۔ اُٹھائے ڈھول اور تاشے اور چلے ہمایوں کے مقبرے۔ پُورب میں یعنی مشرقِ بعید تو اتنی بار جانا ہوا ہے کہ ہم ٹائلٹ جائیں تب بھی لوگ یہی گمان کرتے ہیں کہ ٹوکیو گیا ہے۔ ایک روز ہمارے چپڑاسی نے ایک بزرگ کو فون پر یہی جواب دیا۔ آخر ہم بندہ بشر ہیں۔ کبھی کبھی ٹائلٹ جاتے ہی ہیں۔ اِس فطری حق کو ہم سے کوئی چھین نہیں سکتا۔ اِن بزرگ نے ٹوکیو کا گمان کر کے دریافت کیا۔ کتنے دن کے لیے؟ چپڑاسی نے کہا: ”جی بس پانچ دس منٹ میں آ

جائیں گے۔ ہاں کچھ غور و فکر کرنے لگے تو آدھا پَون گھنٹہ جانیے۔" اِس پر وہ بزرگ بہت بھنّائے کہ چپڑاسی ہو کر ہم سے مسخری کرتا ہے؟ آنے دو اپنے صاحب کو ٹوکیو سے واپس۔

خبر وہ دن بھی زیادہ دور نہیں جب لوگ ٹوکیو سے دس پانچ منٹ یا آدھ پَون گھنٹے میں لوٹ آیا کریں گے۔ یہ حساب کا سوال ہے کہ اگر پانچ ہزار میل کا سفر ابنِ بطوطہ بارہ برس میں طے کرے تو ابنِ انشا کتنے عرصے میں کرے گا۔ ابنِ تو ابن سے کٹ گیا حساب صرف بطوطہ اور انشا کا رہ گیا۔ خیر بطوطہ کا سفر ہماری طرح کا تھوڑی ہوتا تھا کہ جہاز میں بیٹھے، بیلٹ باندھی، بیلٹ کھولی۔ ایک آدھ چھوٹا حاضری ایک آدھ بڑا کھانا اور منزل پہ پہنچ بھی گئے۔ وہ تو راستے میں مزے لیتا جاتا تھا۔ ہر مُلک میں نکاح کرتا ہوا اولاد چھوڑتا ہوا۔ کبھی قاضی بن گیا، کبھی وزیر بن گیا۔ کہیں قزّاق راستے میں مِل گئے تو فقیر بن گیا۔ آج کے مسافر کا یہ ہے کہ ٹوکیو اور لندن گھوم آیا، صفاہان و سمرقند کی سیر کر آیا، مکّے گیا، مدینے یا کربلا گیا، لیکن رہا موچی کا موچی۔ جیسا گیا تھا ویسا ہی ہر پھِر کے آ گیا۔ افسوس ہمارا کالم ہمارے گھر میں بھی پڑھا جاتا ہے۔ ورنہ عقد بین المسلمین کی جو وارداتیں ہمارے اِس نیم ہمنام پیش رَونے کیں، اُن کی حکایتِ لذیذ پر رشک کا مضمون باندھتے۔

اپنی ایک کتاب میں ہم نے ابنِ بطوطہ کا تعاقب تو کیا، لیکن وہ ہمارے ہاتھ نہ آیا۔ کہیں سراندیپ کی طرف کو نکل گیا اپنے ہاتھ مزید پیلے کرنے کے لیے۔ بے شک اُس زمانے میں بھی بہت سے لوگ سیدھے سیدھے مُنہ کالا کر لیا کرتے تھے لیکن شُرفا پہلے ہاتھ پیلے کرنا زیادہ پسند کرتے تھے۔ اُس زمانے میں سفر کا ایک لُطف یہ تھا کہ نُور کے تڑکے کسی نئے شہر کے دروازے پر پُہنچے اور وہاں کا بادشاہ لاولد اُسی رات مرا۔ تو لوگ پکڑ کر سر پہ تاج بھی رکھ دیا کرتے تھے۔ آدمی کا پیچھے اپنے کام کا کتنا بھی ہرج ہوتا ہو وہ کتنی ہی عرض معروض کرے، اُسے پُشت در پُشت بادشاہی کرنی ہی پڑتی تھی۔ اب تو شہر کا دروازہ کھولنے سے پہلے ویزا دیکھتے ہیں، ہیلتھ سر ٹیفکیٹ کا پوچھتے ہیں، مسافر کا بُقچہ کھلواتے ہیں کہ پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے۔

اس جہت کے سفر میں اکثر ہمارے ساتھ یہ ہوا کہ جمبو جیٹ خالی ملا اور چار پانچ سیٹیں ملا کر سونے خواب دیکھتے گئے۔ یہ لفتانزا کا جہاز کھچا کھچ بھرا تھا۔ اور نشست ایسی جگہ ملی تھی کہ ہم تک آتے آتے ائیر ہوسٹس کی چائے ختم ہو جاتی تھی۔ ہاتھ صاف کرنے کے تولیے ختم ہو جاتے تھے، اور تو اور اُس کی مُسکراہٹ ختم ہو جاتی تھی بلکہ حسن بھی قطار نمبر ۱۹ کی سیٹ نمبر ۴ تک پہنچنے سے پہلے ختم ہو جاتا تھا۔ یہ بڑا ڈی سی ۱۰ جہاز ہے اور اِس کی پرواز کے کیا کہنے۔ موٹر ہے ذوالفقار علی خاں کا کیا

خموش۔ کُچھ جرمن بیبیاں، کُچھ جاپانی بیبیاں ترت پھرت کرتی نظر آتی ہیں۔ اچھّی خوش جمال اور خوش خصال۔ خوش خصال تو وہ بھی ہے جو ہمارے حصّے میں آتی ہے۔ لیکن صرف خوش خصال ہے۔ اس کی تلافی ہمیں صیغۂ تانیث کے دیگر مسافروں کو گھور کر کرنی پڑتی ہے۔ گھورے جانے سے کسی کا کیا بگڑتا ہے، بلکہ حُسن اور نکھرتا ہے۔

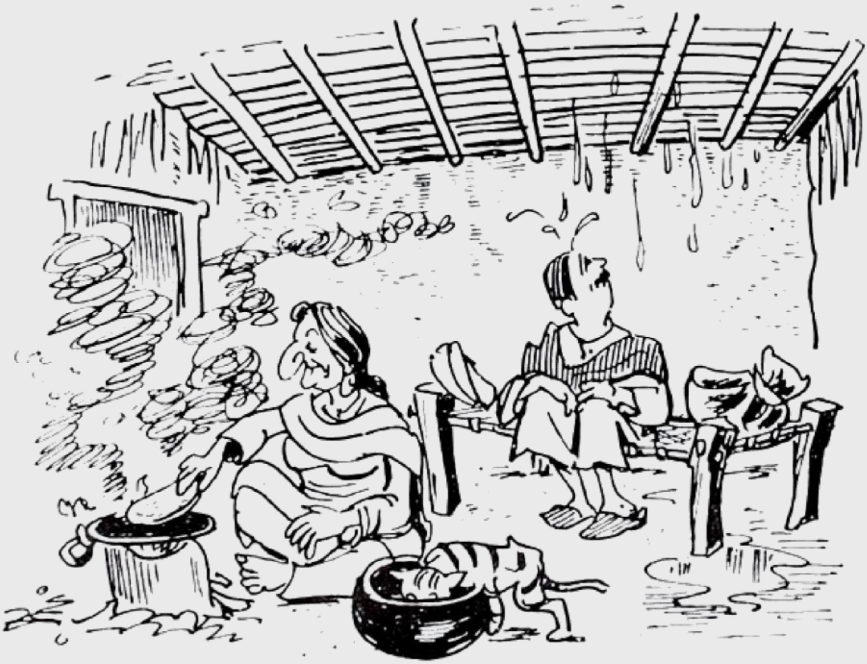
ہم رات پونے ایک بجے سوار ہوئے تھے دو بجے کے قریب تہجد کھایا اس طعامِ نیم شبی کو اور کیا کہہ سکتے ہیں۔ نیند آتی ہے پر نہیں آتی۔ مشتاق احمد یوسفی کی کتاب ”زر گزشت“ جو آج شام ہی آئی ہے، ہمارے شامل بدھنا ہے۔ لیکن اِسے ہم اِس ڈر سے نہیں کھولتے کہ پڑھنی شروع کر دی تو ختم ہو جائے گی اور یہ ظالم دس سال سے پہلے دوسری کتاب نہیں لکھے گا۔ بنکاک ابھی پُہنچے نہ تھے کہ جہاز کے کپتان نے للکارا۔ صاحبو آگے خطرناک مقام ہے۔ ائیر پاکٹ ہے، ہچکولے لگیں گے۔ چوکس ہو جاؤ۔ حفاظتی بند باندھ لو۔ ایسے موقع پر سندباد جہازی کی کہانیوں میں جہاز کا ناخُدا اپنی پگڑی اُتار پھینکتا تھا، داڑھی نوچتا تھا اور سر میں نمک ڈال کر مسافروں کو خبر دار کرتا تھا کہ ہم راستہ بھٹک گئے ہیں۔ جہاز چٹّان سے ٹکرایا چاہتا ہے توبہ استغفار کر لو، وغیرہ وغیرہ۔ ہمارے ناخُدا نے سیدھے سبھاؤ، اعلان کرنے پر اِکتفا کی، زمین اور

آسمان کے درمیان معلّق مسافر کو ایسے موقع پر خُدا لا محالہ یاد آتا ہے اور وہ حسبِ توفیق اور حسبِ اوسان توبہ استغفار بھی کرتا ہے۔ دُعا بھی پڑھنا ہے۔ دُعا کے لیے ابھی تک اللہ تعالیٰ کا نعم البدل نہیں نکلا۔ بے شک ہمارے مخدوم جناب جوش ملیح آبادی نے ایک زمانے میں قوّت و حیات، نام کی کوئی چیز اِس مطلب کے لیے دریافت یا ایجاد کی تھی۔ اور ایسے لوگ بھی ہیں جو مادہ، سالمہ یا الیکٹرون وغیرہ کو کائنات کا خالق جانتے ہیں۔ لیکن اِس قسم کی دُعا مانگنا کچھ جچتا نہیں کہ یا "قوّت و حیات" اپنے جوش ملیح آبادی کے صدقے ہمارے گناہ معاف کریں یا مادّے ہمیں نیک عمل کی توفیق دے، یا سالمے ہمیں رزق عطا کر۔ یا الیکٹرون ہمارے محبوب کو ہم پہ مہربان کر، ہمارے قدموں میں لا کر ڈال دے یا مولیکیول MOLECULE ہمیں تیری ہی رحمت کا آسرا ہے۔ ہم ذاتی طور پر مولیکیول کی بجائے مولا سے مدد مانگنا ہی بہتر سمجھتے ہیں۔ مولیکیول کا کیا ہے سُنے نہ سُنے۔ چنانچہ اِس موقع پر بھی جب کہ جہاز یک لخت کئی سو فِٹ فضا کے جوف میں گرا، ہم نے اپنی سلامتی کی دُعا مانگی تاکہ اگلے کی پہلی کو جو زیادہ دور نہیں ہے، تنخواہ وصول کر سکیں۔ ہمیں قلق اِس بات کا ہو رہا ہے کہ دُعا تو ہم مانگیں گے اور اپنے خُدا سے مانگیں گے جو ہم کلمہ گوؤں اور ایمان والوں کا ہے، اِس کا فائدہ اُن سب مُشرکوں کو

مُفت میں پُہنچے گا جو ہمارے ساتھ کی سیٹوں پر بیٹھے ہیں۔ ہمیں بچانے کے لیے ہمارے خُدا کو انہیں بھی خواہ مخواہ بچانا پڑے گا۔ حالانکہ اُن میں سے کسی نے اپنے بازو پر سو روپے کا امام ضامن تک نہیں باندھ رکھا۔ کُچھ جرمن ہیں، کچھ جاپانی ہیں، کُچھ امریکن ہیں، غرضیکہ سب کے سب بد عقیدہ، بد اعمال۔ کیا کوئی ایسی صورت نہیں کہ ہم لوگ دُعا کیا کریں تو اُس کی برکت اور فائدہ صرف ہمیں تک محدود رہا کرے۔ یوں ہماری وجہ سے مُفت میں آفات اور مصائب سے بچتے رہے تو اِن لوگوں میں دائرۂ اسلام میں آنے کی تحریک کیسے پیدا ہو گی۔ مذاق نہیں، سوچنے کی بات ہے۔

اب یہ مسائلِ تصوّف ختم اور ہمارا بیان بھی ختم کہ اعلان ہوا ہے۔ ہانگ کانگ آیا چاہتا ہے۔ یہاں وقت کا فرق اور زیادہ ہے۔ جس وقت ہمارے ہاں آٹھ بجتے ہیں، اِن لوگوں کے بارہ بجتے ہیں حالانکہ ہانگ کانگ میں سِکھ بھائیوں کی تعداد اتنی زیادہ نہیں ہے، اکثریت چینیوں کی ہے۔ یہ چینی تو کوئی دِن میں چینیوں سے جاملیں گے۔ سِکھ بھی تُسیں تُسیں کرتے اپنے وطن واپس آجائیں گے۔ اصل بارہ تو انگریزوں کے بجیں گے جِن کی یہ قلمرو آج تو ہے، کل کا پتہ نہیں۔ ہائے کیا دِن تھے کہ برطانیہ کی سلطنت پر سورج غروب نہیں ہوتا تھا۔ اب طلوع ہی نہیں ہوتا۔ کیونکہ سلطنت ہی

نہیں رہی۔ نصف النّہار کے وقت یعنی دِن کے بارہ بجے بھی یورپ کی اقتصادی برادری کے دُھندلکوں میں ٹامک ٹوئیے مارتے نظر آتے ہیں۔ بیچارے۔



سرائے کے اندر

جاپان کو ایک جمیل الدّین عالی کی ضرورت ہے۔

مسافر کا گھر سرائے۔ سرائے کا احوال یا تو ہم نے اودھ پنچ والے مرزا مچھو بیگ ستم ظریف کے ہاں دیکھا ہے یا میر باقر علی داستان گو کی داستانوں میں دھوانسے ہوئے چھپّر اڑواڑوں پر کھڑے لونی لگی دیواریں۔ ٹیڑھے میڑھے کِواڑ۔ ٹمٹماتا چراغ شام کی بارش کا کالا بدبُو دار پانی سارے صحن میں گشت کرتا ہوا جس میں ایک لوٹا بھی

ڈبکیاں کھانا بہتا جا رہا ہے۔ مسافر جھٹ پٹے کے وقت بارش میں بھیگتا پہنچتا ہے۔ بی بھٹیارن کوئی کوٹھری ہے؟ ہاں میاں جی مل جائے گی لیکن چار آنے کرایہ ہو گا۔ ایک بھیگی ہوئی جھلنگی چارپائی لا ڈالتی ہے جو کان سُوتی بھی ہے۔ مسافر کے دیکھتے دیکھتے اُس نے ایک پاؤں ایک سِرے پر رکھا اور دوسرے سِرے پر دوسرا پاؤں رکھ کر زور لگایا۔ کڑک کی آواز آئی اور چولیں اپنی جگہ بیٹھ گئیں۔ لو میاں جی آرام کرو۔ مسافر بھوکا تھا۔ ایک طرف دال چڑھا دی۔ دوسری طرف روٹیاں اُتارنے بیٹھ گئی۔ آج لوگ نہ سرائے کو جانیں نہ بھٹیارن کو پہچانیں۔ یہ محاورہ بھی کسی کی فہم میں نہ آئے گا کہ "بی بھٹیارن۔ دال دو گی یا ننگا ہی سو رہوں۔" اصفہان کی سرائے بھی یاد آتی ہے جس پہ ڈاکا ڈالنے میں ترکمانوں کے سردار کے ساتھ ساتھ اپنے حاجی بابا بھی تھے جیسے بدھو میاں حضرت گاندھی کے ساتھ ہوا کرتے تھے۔ اب سرائے ہے بھی تو اُس کا نام دِل پسند ہوٹل وغیرہ رکھا جاتا ہے۔ ہمیں سرائے نام کی ایک ہی جگہ میں اب تک ٹھہرنے کا اتّفاق ہوا ہے وہ تھی دِلّی میں پہاڑ گنج میں۔ لیڈی ہارڈنگ کی سرائے۔ ہم وہاں ریڈیو میں نوکر ہوتے تو مکان وغیرہ کوئی نہ تھا۔ یہاں دو روزہ مسافر بن کر ٹھہر گئے۔ کرایہ واجبی۔ سرائے کے منیجر ایک سردار جی تھے۔ ہمارے ضلع کے ایک گاؤں میں اُن کا کوئی رشتہ دار نکلتا تھا اور ہم نے کہا تھا۔ ہاں ہاں۔ ہم

اِس گاوں کو اچھّی طرح جانتے ہیں۔ بس اِسی نسبت سے وہ ہمیں کمرہ بدل بدل کر توسیع دیتے رہے۔ پاکستان کے لیے انشاجی نے بالآخر اِسی سرائے سے کوچ کیا۔

لیکن بی سرائے جس میں ہم دمِ تحریر بیٹھے لکھ رہے ہیں، بس نام کی سرائے ہے۔ ہمارا اشارہ جاپانی سرائے کی طرف بھی نہیں جسے رائیگان کہتے ہیں۔ چٹائی کا فرش، آلتی پالی مار کر بیٹھے۔ اور چٹائی پہ ہی استراحت کیجئے۔ جوتا باہر اُتار کر کمرے میں آیئے۔ ہم ایسی سرائے میں بھی ایک بار ٹھہر چکے ہیں، آرام دہ بھی ہے لیکن دمِ تحریر جس قیام گاہ کا ذکر ہے اُس کا نام ہالیڈے اِن ہے۔ INN بمعنی سرائے۔ امریکی نژاد اِن ہوٹلوں کا سِلسِلہ دُنیا بھر میں پھیلا ہوا ہے۔ پاکستان میں بھی بن رہے ہیں۔ میاں کرایہ تو جو ہوگا دے لیں گے آخر کھاتے پیتے آدمی ہیں۔ سامنے دھلائی کے ریٹ دیکھ کر ذرا دِل بیٹھ گیا ہے۔ سوٹ ڈرائی کلین کرایئے گا، ستاون روپے۔ فقط استری کرنا ہو تو ساڑھے اٹھائیس روپے۔ قمیص کی دھلائی ساڑھے اٹھائیس روپے۔ پتلون کی ساڑھے پندرہ روپے۔ خیر ہم پر اِس کا اِطلاق نہیں ہوتا۔ ہم ابھی چھوا چھو سے فارغ ہوئے ہیں۔ قمیص وہ لٹک رہی ہے۔ آستینوں سے ٹپ ٹپ پانی گرتا ہوا۔ بنیان اور رومال اُدھر کھونٹی پر ٹنگے نُچڑ رہے ہیں۔ اگر جاپان میں زیادہ ٹھہرنے کا ارادہ ہوا تو دھوبی کا پیشہ ہی اختیار کریں گے۔ اِستری کی البتّہ دقّت ہے۔ پار سال تو

ٹوکیو کے ہوٹل میں دھات کی ایش ٹرے کو کھولتے پانی میں گرم کر کے اُس سے سوٹ کی شِکنیں نکالی تھیں۔ یہاں اِن ظالموں نے شیشے کی ایش ٹرے رکھی ہے۔

جاپانی رائیگان سراؤں کی بات اور ہے، جاپان کے ہوٹلوں میں سارا سامانِ آرائش اور آسائش کا مغربی طرز کا ہی ہوتا ہے۔ اِس پر مستزاد یہ ہے کہ رات کو پہننے کا جھبر جھالا اور سلیپر ہوٹل کی طرف سے موجود رہتے ہیں۔ یہاں نہ یہ نہ وہ۔ ہم اپنے ساتھ سلیپنگ سوٹ نہیں لائے۔ یہاں اپنا ستر ڈھانکنے کا موقع جاپانیوں کو دینا چاہتے تھے۔ اب بیٹھے اِس چکنم میں ہیں کہ کیا کریں۔ سوٹ پہن کر سو نہیں سکتے۔ ویسے حیادار آدمی ہیں، آج سے نہیں ہمیشہ سے غُسل خانے میں بھی تولیہ باندھ کر نہاتے ہیں۔ کوئی بھٹیارن بھی نہیں جس سے کہہ سکیں بی بی دال دو گی یا ننگا ہی سو رہوں۔ ہم نے اپنے مشرقی اخلاق اور مغربی سوٹ کے تحفّظ کے لیے کیا کیا ہو گا۔ قارئینِ کرام اِس کا اندازہ کر کے ہمیں خط لکھیں، جس کا جواب درست ہو گا اُسے ہم کوئی نہ کوئی انعام دیں گے اور دیتے ہی رہا کریں گے۔

نیچے لابی میں امریکیوں کا ہجوم تھا۔ جھُرمٹ بنا کر سفر کرتے ہیں۔ دوسرے ملک میں جائیں تو امریکی ہوٹل میں ٹھہرتے ہیں۔ امریکی کھانا، امریکی ہیمبرگر کھاتے ہیں۔ امریکیوں ہی سے ملتے ہیں۔ امریکی زبان ہی بولتے ہیں۔ ٹی وی پر امریکی

پروگرام دیکھتے ہیں۔ کیسی غیر امریکی چیز سے اپنے سفر کو آلودہ نہیں کرتے۔ ہماری سمجھ میں کبھی یہ نہیں آتا کہ یہ سب چیزیں تو امریکہ میں بھی میسّر ہیں وہاں سے باہر کیوں آتے ہیں۔ ہم کمرہ ۲۹۷ میں داخل ہوئے تو ظالموں نے سامنے میز پہ بائیبل کا عہد نامۂ جدید کھول کر رکھ چھوڑا تھا۔ پتہ نہیں اِن لوگوں کو ہمارے اخلاق کی طرف سے اندیشہ ہے یا عاقبت کی طرف سے تشویش ہے۔ یاروں کو مُجھ سے حالی کیا بدگمانیاں ہیں۔ ہم نے پڑھا۔ بہت اچھّی اچھّی باتیں لکھی ہیں۔ بڑے عمدہ الفاظ میں نیکی اور راست بازی کی تلقین ہے اور خداوند خُدا کی تمجید ہے۔ اِس کے مطالعے سے ہماری خاطر خواہ اصلاح ہو سکتی ہے لیکن ہمیں خود غرضی سے کام نہیں لینا چاہیئے۔ اِس کتاب کو اس کمرے میں ٹھہرنے والے امریکیوں اور جاپانیوں کے لیے محفوظ رہنے دینا چاہیئے۔ پس اٹھا کر چُوم کر دراز میں بند کر دی ہے۔ ٹی وی تو یہاں ہر کمرے میں ہے۔ تھوڑی دیر پہلے کھولا تھا وہاں ۱۴۸ نامی پروگرام ہو رہا ہے۔ بڑا بے حیائی کا پروگرام ہے۔ ایک صاحبہ پورے کپڑے اُتار کر کوچ پہ لیٹی اینڈ رہی ہے۔ یہ خیال نہیں کرتیں کہ ننگے پنڈے کو ہوا لگنے سے نمونیہ ہو سکتا ہے۔ کُچھ اور لگنے سے کُچھ اور بھی ہو سکتا ہے۔ اچھا اِس کو کُچھ نہ ہو تو ہم تو گرم سرد ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ ہمارا تو برقع پوشوں کے ننگے ٹخنے اور کان کی لویں دیکھ کر یہی عجب حال ہو جاتا ہے۔



ٹی وی کھولا تو PM 11 کا پروگرام ہو رہا تھا

ہمارے تو کوئی پردہ نشین چلمن سے باہر خالی ہاتھ نکال کر حکیم جی کو نبض دکھائے تو حکیم جی بیمار ہو جاتے ہیں۔ یہ پروگرام خاصا چلا۔ ہم چاہتے تو اِسے کسی بھی وقت بند کر سکے تھے لیکن ذرا دور بیٹھے تھے۔ ہماری طبعیت میں تساہل ہے۔ کون جاتا بٹن دبانا۔ پھر یہ خیال کیا کہ اپنے وطن میں تو عُریانی اور بے حیائی کے مظاہر سے عِبرت پکڑنے کے مواقع کم ہی نصیب ہوتے ہیں۔ وہاں کے حصّے کی عِبرت یہیں سے پکڑتے چلیں۔ یاد رکھیے یہ قوم بے حیائی کی وجہ سے ایک روز ضرور تباہ ہو گی۔ تباہ تو

ہم بھی ہوں گے۔ لیکن بے حیائی کی وجہ سے نہیں، کسی اور زیادہ شریفانہ وجہ سے ہوں گے۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا یہاں کے ٹیلیویژن سے ”دُنیا پاکستان“ جیسے پاکیزہ پروگرام کیوں نہیں ہوتے۔ بس لہو لعب اور کھیل تماشے پر سارا زور ہے۔ جاپان کو بھی ایک جمیل الدّین عالی کی ضرورت ہے۔

جاپان کا رومۃ الکبریٰ- کیوٹو

شہر کیوٹو جاپان کا لاہور ہے، اصفہان ہے، استنبول ہے، دِلّی ہے، رومۃ الکبریٰ ہے۔ دار السلطنت نہیں ہے، پھر بھی جاپان کی روح کا ترجمان مانا جاتا ہے۔ کلکتے کو انگریز صاحبان عالی شان نے اتنے دِنوں حکومت کا مستقر رکھا، لیکن لوگوں کے دِلوں پر تو دِلّی ہی راج کرتی رہی۔ خیر ۱۸۹۸ تک کیوٹو دار السلطنت بھی رہا۔ گیارہ صدیوں تک اِسے یہ شرف بھی حاصل رہا۔ اِسی لئے جہاں اینٹ اُٹھاؤ نیچے سے تاریخ اور صنادید کا خزانہ برآمد ہو گا۔ یہ شہر محلوں اور محل سراؤں، باغوں، باغیچوں، مدرسوں،

خانقاہوں، درگاہوں اور مندروں سے پٹا پڑا ہے۔ اِن کی تعداد سینکڑوں کو پہنچتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ خوب صورت بھی ہے، سر سبز بھی ہے، ہوٹل بازار، مغازے، گیشا گھر اور نائٹ کلب بھی بکثرت اپنے دامنِ دولت میں رکھتا ہے۔ شہر کے بیچوں بیچ دریا ہے۔ نہریں بھی ہیں، پہاڑیاں بھی، چشمے بھی۔ چودہ لاکھ کی آبادی ہے۔ پھر بھی تعریف کے طور پر جاپان کا سب سے بڑا گاؤں کہلاتا ہے۔ ہم یہ کہتے کہ جنّت کا نقشہ ہے لیکن پھر حفیظ جالندھری سامنے آجاتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

کیا ہے جنّت، چند حوریں، اِک چمن، دو ندیاں

کیوٹو میں کوئی نہ کوئی میلہ ہر وقت لگا رہتا ہے۔ یہاں کے لوگ سیلانی اور شوقین ہیں۔ سال میں کوئی دو کروڑ سیاح تو جاپان ہی کے اکناف و اطراف سے آتے ہیں۔ تین لاکھ کے لگ بھگ غیر مُلکی اِن کے علاوہ۔ پار سال ہم نے اِس شہر میں کیوٹو کا سب سے بڑا تہوار گیون متسوری دیکھا تھا۔ بلکہ ہمارے یار عزیز ابو الخیر کشفی نے ہمیں دِکھایا تھا اور اِس کی رونق اور اژدہام سے لکھنؤ کا محرم الحرام ہمیں یاد آیا تھا، کہ تھالی پھینکو تو سر ہی سر جائے۔ ایک سو متسوریاں تو اِس مئی کے مہینے میں بھی پڑ رہی تھیں۔ ایک مندر میں ڈھول تاشوں کے ساتھ گونگا کھیل ہو رہا تھا۔ فقط حرکات و سکنات کی زبان میں یہ کوئی سات سو سال کی پرانی روایت ہے۔ ایک درگاہ سے

جلوس نکل رہا تھا۔ ایک در گاہ میں گُل پوش لڑکیوں اور سمورائی لباس زیبِ تن کئے ہوئے پری زادوں کی پریڈ تھی۔ ایک در گاہ میں روایتی گھُڑ دوڑ کا اہتمام تھا اور ایک میں گھوڑے کی پیٹھ سے تیر اندازی کا انتظام تھا۔ ایک مندر میں پھولوں کا میلہ تھا اور لڑکیوں کا رقص تھا۔ ایک در گاہ میں چائے کی رسم اور گارڈن پارٹی ہو رہی، ساتھ ہی مقدّس آگ بھڑکائی جا رہی تھی۔ ایک اور مندر قلّہ کوہ پر ہے۔ وہاں پورے چاند کی رات کو سنگی شمعوں کا چراغاں ہو رہا تھا اور پُجاری شمعیں ہاتھوں میں لیے طواف کرتے شانتی شانتی الاپ رہے تھے۔ امنِ عالم کے لیے دُعائیں کر رہے تھے۔ کیوٹو کے تین بڑے تہواروں میں سے آوئی متسوری اِس مہینے میں پڑتا ہے۔ اِس میں گیارہویں صدی کی فضا کو زندہ کیا جاتا ہے۔ یہ تہوار خود چھٹی صدی عیسوی سے چلا آ رہا ہے جب کہ شہنشاہ کن می نے ایک شاہی ایلچی کو دو مشہور در گاہوں میں اِن دیوی دیوتاؤں کو راضی کرنے کے لیے بھیجا تھا جنھوں نے شہنشاہ کی اِطّلاع کے مطابق طوفان لا کر فصلیں تباہ کر دی تھیں کیونکہ وہ ناشُکرے اور بد اعمال لوگوں سے جو ان کی مناسب پوجا نہ کرتے تھے۔ ناراض ہو گئے تھے۔ ہمیں یہ جان کر اطمینان ہوا کہ بد اعمال لوگ ہر زمانے میں رہے ہیں۔ ہمیں شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ سارا ڈراما اِس تہوار میں دُہرایا جاتا ہے۔ جلوس پرانے قصرِ شاہی

سے نکلتا ہے اور شیمو گامو درگاہ جاتا ہے۔ وہاں سے کامی گامو درگاہ۔ ایک لڑکی کنواری یعنی دیو داسی کا بہروپ بھرتی ہے اور اُس کی پالکی لوگ کاندھوں پر اُٹھاتے ہیں۔ یہ بہت خوبصورت دوشیزہ ہوتی ہے۔ تہوار اور ڈرامانہ ہوئے تو بھی لوگ اُسے سر آنکھوں پر اُٹھاتے، بلکہ بِٹھاتے۔ جنجانامی درگاہ میں ایک اور متسوری ہوتی ہے۔ اِس میں گانے بجانے کے علاوہ باقاعدہ مشاعرہ بھی ہوتا ہے۔ ایک مندر میں نویں صدی کے ایک شاعر کی برسی بھی منائی جاتی ہے۔ ایک شاعر کی برسی گیارہ سو برس تک سال بسال منائے جانا بڑے حوصلے اور گردے کا کام ہے۔ ہم تو غالبؔ اور خسرو تک کو صد سالہ برسیوں سے بھگتاتے ہیں۔ بلکہ میرؔ وغیرہ کو اِس لائق بھی نہیں جانتے۔ ایک بڑی خوبصورت درگاہ تو کیوٹو کے آباد ہونے سے بھی پہلے کی ہے۔ یہ گرج دیوتا کی ہے۔ گرج بابو والا گرج نہیں بلکہ جو چمک کی معیّت میں موسم کی خبروں میں آتا ہے۔ شجرہ اِس کا یُوں بتاتے ہیں کہ یہ بُت کا دیوتا ندیا کی دیوی پر عاشق ہوا اور اُس سے گرج دیوتا پیدا ہوا۔ ایسے کام کا ایسا ہی نتیجہ ہوا کرتا ہے۔ کسان لوگ اِس سے بارش مانگتے ہیں اور زیادہ ہونے لگے تو اِسی سے گرمی اور خُشکی۔ یہ ہم اُن لوگوں کا ذکر کر رہے ہیں جو ہمارے آپ کے لیے مشینیں موٹریں، ریڈیو ٹیلی ویژن کمپیوٹر وغیرہ بناتے ہیں۔ اب تو مصنوعی بارش برسانے کے آلات بھی

نکل آئے ہیں۔ دیکھئے دیوتاؤں کی دیوتائی کہاں تک چلتی ہے۔ جو بی بی ہمیں اس شہر میں گھمارہی تھیں، پٹ پٹ انگریزی بولے جارہی تھیں۔ انہوں نے سارا سبق زبانی یاد کر رکھا تھا. وہ لطیفے بھی جن سے وہ ہمیں ہنسانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ کوئی نئے یا طبع زاد نہ تھے اور وقت کے وقت نہ سوجھے تھے۔ بلکہ گائیڈ کی پیشہ ورانہ تقریر کا حصّہ تھے۔ دمِ تقریر اُن کا مُنہ مناظر کی طرف نہیں ہماری طرف ہوتا تھا۔ اِس لئے اکثر یہ ہوا کہ جب انہوں نے فرمایا۔ یہ سامنے کا سنہری کلس والا مندر آپ دیکھتے ہیں؟ تو اُسی مندر کو سنہری کلس سمیت گزرے دو منٹ ہو چکے ہوتے تھے۔ جہاں ہم پوچھتے کہ یہ چمچماتی چھت والی عمارت کیا کوئی مندر ہے؟ وہ فرماتیں۔ نہیں یہ خانقاہ ہے۔ جس مقام کو ہم خانقاہ فرض کرتے، اُدھر سے حکم ہوتا کہ مندر ہے۔ ہم نے کہا۔ اے بی بی۔ پہلے ہمیں خانقاہ اور مندر کا فرق سمجھاؤ۔ بولیں تمہارے مندر کیسے ہوتے ہیں۔ ہم نے کہا۔ ہمارے ہاں تو بس من کا مندر ہوتا ہے۔ دوسری عبادتوں کے لیے مسجد ہوتی ہے۔ تب اُس بی بی نے وضاحت کی کہ خانقاہ یا شرائن، شنتو مذہب کی عبادت گاہ ہوتی ہے اور ٹمپل یعنی مندر کا مطلب بودھ مندر ہے۔ خانقاہ میں جلال و جمال ہوتا ہے۔ بودھ مندر میں سادگی ہوتی ہے۔ ہر طرح کی آرائشوں سے آسائشوں سے مُبرّا۔ آخر مہاتما بدھ ہی کو تو اس میں بٹھانا ہوتا ہے۔ وہ

خود عیش و عشرت کی زندگی سے کنیاتے تھے۔ مزید تحقیق پر معلوم ہوا کہ جاپان کے لوگ صلح کُل ہیں۔ بدھ مذہب کو بھی مانتے ہیں اور پرانے بزرگوں کے دین شنتو مذہب سے بھی نہیں بگاڑتے۔ دونوں جگہ ڈنڈوت کرتے ہیں اور ماتھا ٹیکتے ہیں۔ شادی بیاہ یا کوئی اور خوشی کا موقع ہو تو شنتو مذہب کی رسوم بجالاتے ہیں۔ کوئی موقع غمی اور ناشادی کا ہو تو بدھ مت کو اپناتے ہیں۔ گنگا گئے تو گنگا رام، جمنا گئے تو جمنا داس۔ یوں سمجھئے جیسے ہم چھ دِن تو مسجد میں نماز باجماعت ادا کریں۔ اتوار کی اتوار گرجا جائیں اور شیوراتری پر مندر میں جا کر گھنٹہ بجائیں اور آرتی اُتاریں۔ ہندوستان میں ایک قوم ملکانے ہوا کرتی تھی۔ نام مسلمانوں کے سے، رسمیں ہندوؤں کی سی، بشکل مومنان، کرتوت کافراں، جب اِدھر سے شُدھی اور اُدھر سے جواباً تبلیغ کا غلغلہ شروع ہوا تو اُن کے ہاں پنڈت پہلے پہنچ جاتا تھا۔ تو اُن کی شُدھی کر لیتا تھا۔ اُن کو پرکھوں کی ریت یاد دلاتا تھا اور اُن سے رام رام کہلواتا تھا۔ مسلمانوں کا بس چلتا تھا تو ردِّ بدعت کی تلقین کر کے دائرۂ اسلام میں لے آتا تھا۔ سُنا ہے مسلمان ہونے کے بعد بھی اُن میں سے بعض مندر کے سامنے سے گُزرتے تھے تو اِدھر اُدھر دیکھ کر مورتی کو نمسکار کر ہی لیتے تھے۔ کہ بظاہر تو خُدائے ذوالجلال ہی اچھّا ہے لیکن کیا پتہ؟ اِس کے مُقابلے میں اپنے ہاں کے لوگوں کو دیکھئے کتنے تنگ دِل اور نارواداد

واقع ہوئے ہیں۔ اگر کوئی شخص حج بھی باقاعدگی سے کرے اور اسمگلنگ یا بلیک مارکیٹ بھی، تو منع بے شک نہ کریں اعتراض تو جڑتے ہی ہیں۔ ہمارے ہاں خداوند خُدا اور سونے کے بچھڑے کی بیک وقت پوجا بھی بُری سمجھی جاتی ہے۔ کوئی پوچھے اِس میں کیا عیب ہے۔ حضرت واعظ بھی درونِ خانہ کُچھ کریں اور بیرون خانہ کُچھ اور تو لوگ انگشت نمائی سے جینا اجیرن کر دیتے ہیں۔ حالانکہ تھوڑی سی کشادہ دِلی سے کام لیا جائے تو زندگی میں کفر و اسلام، گناہ و ثواب، مے اور مُصلّےٰ، سب کے لیے بخوبی گنجائش نکالی جا سکتی ہے اور نکالنے والے نکالتے ہی ہیں۔ صاحبو اِن لوگوں کا تصوّر مذہب کا ہم لوگوں کا سا نہیں ہے کہ اِس کو نظامِ حیات بنالو اور خود کو اُس کے سانچے میں ڈھالو۔ بلکہ یہ ہے کہ عید شب برات پر یا بسنت بیساکھ میں گھنٹہ بجانے اور بھجن گانے کو جی چاہے تو خانقاہ یا مندر میں چلے جاؤ، جو بھی نزدیک ہو خواہ شنتو مذہب کا ہو یا بدھ مت کا۔ شراب کباب اور لہو لعب سے بھی اِن کے مذہب اِن کو نہیں روکتے۔ خوفِ خُدا سے بھی اِن کو عاری سمجھئے۔ کیونکہ خُدا کا تصوّر ہی اِن کے ہاں نہیں ہے جو علیم و خبیر یعنی سب کُچھ دیکھتا جانتا ہے۔ ہمیں اِن لوگوں پر بہت ترس آیا۔ اتنا البتّہ ہے کہ یہ لوگ مین ہولوں کے ڈھکنے نہیں چُراتے اور دودھ میں پانی اور گھی میں گریس نہیں ملاتے حالانکہ اِن کا خُدا علیم و بصیری نہ ہونے کے باعث اِن کو اِس کے

عمدہ مواقع حاصل تھے۔ یہ لوگ ہسپتال وغیرہ بنا کر خلق کی خدمت وغیرہ بھی کرتے رہتے ہیں اور محتاجوں کی بھی مدد کرتے ہیں۔ تاہم بوجہ بدعقید گی اِن کے دوسری دُنیا میں بخشے جانے کی ہمیں کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ کوئی پوچھے کہ بھلے مانسو جب تُم کو جنّت میں جانا ہی نہیں ہے تو اتنا تردّد اور اِس قسم کے کام نیکی اور فلاح و بہبود وغیرہ کے کرنے کا کیا فائدہ۔ ہمارا اِن لوگوں کو تبلیغ کرنے کا ارادہ تھا لیکن پھر یاد آیا کہ پاکستان کے لوگ تو خود ہمیں محتاجِ تبلیغ سمجھتے ہیں اور کوئی موقع اِس کا ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔

یہاں ایک مندر گولڈن پیولین یا گولڈن ٹمپل کہلاتا ہے۔ یوں کہیے کہ جاپان کا دربار صاحب امرتسر ہے۔ لوگ بڑی دُور دُور سے اِسے دیکھنے کو آتے ہیں۔ ۲۵ برس پہلے ایک نوجوان بھکشو نے جو یہاں رہتا اور درس پاتا تھا لوگوں کو اِس زحمت سے بچانے کے لیے اِسے آگ لگا دی تھی۔ بالکل بھسم کر دیا تھا لیکن یہاں کے لوگوں نے اِس کی قدر نہ کی۔ اِس کی مناسب، گوشمالی اور سرکوبی کرنے کے بعد دوبارہ منڈ کھڑا کر کے اُس پر سونے کے پترے منڈھ دیئے ہیں۔ یہاں کے لوگ طبعاً ایماندار ہیں لیکن اِن کو مزید ایماندار رکھنے کے لیے ایسا انتظام کیا گیا ہے کہ آپ اِسے پچاس گز دُور سے جنگلے کے پیچھے سے دیکھ سکتے ہیں۔ اِس کے اندر یا پاس نہیں جا

سکتے۔ یہ التزام سبھی مزاروں میں ہوتا ہے۔ بھگوان کی چوری کا کوئی مضائقہ نہیں۔ آج ایک کو کوئی چُرائے۔ دوسرے دِن دوسرا پتھّر کا یا کاٹھ کا بھگوان لا رکھتے ہیں۔ سونا البتہ دوسری چیز ہے اسی لئے دُنیا میں بھگوان کے اتنے پُجاری نہیں ملیں گے جتنے سونے کے ملیں گے۔ مندر سے بہت دُور ایک محرابی صدر دروازہ ہے اِس پر لوگوں کے لیے یعنی زائرین کے لیے ہدایات رقم ہیں۔ ایک تو یہ کہ یہاں کسی کو مت مارو یعنی جان سے مت مارو۔ زدوکوب کی بات اور ہے۔ دوسری ہدایت یہ ہے کہ اِس احاطے کے اندر ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے کی ممانعت ہے۔ یعنی اگر ایک سے زیادہ ہیں تو اُن کو اندر نہ لاؤ۔ لاؤ تو باری باری لاؤ۔ ایک ممانعت جھوٹ بولنے کی ہے۔ ایک زیادہ شراب پینے کی ہے۔ زور کس لفظ ہے زیادہ پہ۔ وہ بھی مندر کے احاطے کی حد تک۔ ایک چوری کرنے کی ہے یعنی چوری نہ کرو۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا جب چوری کرنے کی مناہی ہے تو اِس مندر پر سونا منڈھنے کی کیا ضرورت تھی۔ باہر ایک بُڈّھا کھڑا اپنے دھیان میں مگن کوئی چوپائی بڑی لے سے گا رہا تھا۔ جیسے مثنوی پڑھتے ہیں۔ ہم نے اپنی ترجمان سے پوچھا کہ یہ کیا بھیروں ہے۔ اُس نے کہا مندر کا احوال بیان کر رہا ہے۔ رَٹ رکھا ہے، برسوں سے اِس کو دہرائے جا رہا ہے۔ ہم نے کہا یہ تو کوئی مثنوی وغیرہ ہے شاید۔ معلوم ہوا نثر ہے۔ ہمیں تعجّب

ہوا اور ہم نے اپنی رائے پہ اصرار بھی کیا لیکن پھر مولانا شفیع اکاڑوی کا وعظ یاد آیا۔ لوگ اِس پہ بھی شاعری کا گُمان کرتے ہیں۔ اِس گائیڈ کی آواز البتّہ ہمارے مولانا کے آہنگ کے پاسنگ بھی نہیں تھی۔ اِسی لیے تو اِن لوگوں کو لاؤڈ سپیکر وغیرہ ایجاد کرنے کی ضرورت پڑی۔ مصنُوعی سہارے تلاش کرنے پڑے۔

ہم نے پوچھا کہ اَس عزیز طالبِ علم بھکشو نے مندر کو آگ کیوں لگائی۔ ہم نے واضح کر دیا کہ ہم اعتراض نہیں کر رہے صرف استفسار کر رہے ہیں۔ ہماری گائیڈ نے کہا۔ وہ تعلیم سے تنگ آ گیا ہو گا۔ کتابیں مُشکل معلوم ہوتی ہوں گی۔ یہ بات ہمارے جی کو لگی۔ ہمارے ہاں کے طالبِ علموں کو پرچہ مُشکل لگے تو وہ بھی تو یہی کرتے ہیں۔ اسی بھکشو کو مرکزی کردار بنا کر مشہور جاپانی ناول نگار یوکومیشما نے جس نے بعد ازاں ہاراگیری کر کے خُودکشی کی تھی۔ اپنا ناول "کِنکا کُوجی" لکھا ہے۔ یہ زین بدھ مت کے اِس طلاپوش مندر کا جاپانی نام ہے۔

جانا ایک مندر میں

اور پانا راز خوبصورتی، دانشمندی اور خوش الحانی کا

کیوٹو کا نجو کاسل ایک قلعہ ہے جس کی بنیاد ۱۶۰۳ میں پڑی تھی۔ ہمارے اکبرِ اعظم ابھی زندہ ہی تھے۔ اِس کے بعد شکست و ریخت اور مرمّت کی کئی منزلوں سے گزرا۔ یہ رفیع الشّان وغیرہ کُچھ نہیں، ہاں وسیع ضرور ہے۔ ایوان در ایوان اور دلان در دلان۔ شہنشاہی جاپان کی قدیم روایت ہے۔ لیکن ایک زمانے میں شورہ پُشت اہلِ

بیت اور جاگیر دار قسم کے لوگوں نے شہنشاہ کو طاق پر بٹھا کر اپنی اپنی حکومت یا طوائف الملوکی شروع کر دی تھی۔ یہ لوگ شوگن کہلاتے تھے۔ ۱۸۶۷ میں کیوٹو کے شوگن کے دِل میں نیکی آئی اور اُس نے راج پاٹ شہنشاہ کو لوٹا دیا۔ اِس واقعے سے جاپان کے عہدِ نَو یعنی مسیحی دور کا آغاز ہوتا ہے۔ اِسی قلعے میں یہ ایوانِ عام ہے جہاں سلطنت کی واپسی کا اعلان ہوا تھا۔ وہ نیک منش شوگن اِسی قلعے میں رہتا تھا اور دربار کرتا تھا۔ اِس کے بعد دوسرے شوگنوں کو بھی بزوری بابزاری، ترغیب سے یا دھونس سے راہ پر آنا پڑا۔ یہ گویا جاپان میں سرداری نظام کا خاتمہ تھا۔ محلسرا میں داخل ہوتے ہی جوتے اُتارنے پڑے۔ بعض مندروں اور درگاہوں کے احاطوں میں جوتوں سمیت دندنا سکتے ہیں لیکن شاہی محل کا معاملہ دوسرا ہے۔ بے اختیار میرن صاحب یاد آئے۔ غالبؔ کے عزیز شاگرد تھے اور ان کی عقیدت اور محبّت میں غلو کرتے تھے۔ ایک بار کسی نے غالب کا شعر اُن کے سامنے غَلَط پڑھ دیا۔ بہت خفا ہوئے۔ لٹھیا لے کر دوڑے کہ یہ کوئی قرآن حدیث نہیں ہے کہ جیسا جی چاہا پڑھ دیا۔ اُستاد کا کلام ہے۔ صحیح پڑھو۔ پس دیوی دیوتاؤں کی حضوری نہ باشد باادب باملاحظہ ہوشیار۔ اِن ایوانوں میں سب میں تاج و تخت کُچھ نہیں ہے۔ بس تنامی یعنی موٹی چٹائیوں کا فرش ہے۔ دیواروں اور چھت پر کُچھ نقش و نگار ہیں جو وقت نے

دُھندلا دیئے ہیں۔ کہیں درخت ہیں، کہیں پہاڑ ہیں، کہیں مور ناچ رہے ہیں، کل ۳۳ کمرے یا ایوان ہیں، ایک ایوان ہے، خاندانی جاگیرداروں کی پذیرائی کا۔ ایک دوسرا ہے جس میں غیر خاندانی اور غیر پشتینی جاگیردار اور امرا کو باریابی کا موقع دیا جاتا تھا۔ رشتے داروں سے ملنے کا ایوان الگ تھا۔ آپ کہیں گے یہ سب کُچھ تو ایک ہی کمرے یا ایوان میں ہو سکتا تھا۔ لیکن پھر باقی اتنے سارے ایوانوں کا کیا کِیا جاتا۔ اُس زمانے میں کفایت کی رسم یا مُہم ابھی نہ چلی تھی۔ ایک بات یہ ہے کہ اِن ایوانوں کے فوٹو لینے کی اجازت نہیں ہے۔ وہ دیوانِ عام جس کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے، سب سے بڑا ایوان ہے۔ اُس میں مورتیوں سے اِس زمانے کے دربار کا نقشہ جما رکھا ہے۔ کوئی پندرہ بیس درباری منصب دار یا جاگیردار گھٹنے ٹیکے تلواریں سامنے رکھے بیٹھے ہیں۔ نگاہیں سب کی نیچی۔ اُن کے آگے وزراء کی نشست۔ کُچھ وزراء اور مدار الہام ایک دوسرے کی طرف مُنہ کئے مؤدب بیٹھے ہیں۔ اُن سے آگے کافی فاصلہ دے کر شوگن صاحب بیٹھے ہیں اور اُن سے کُچھ ہٹ کر ایک نو عُمر لڑکا تلوار لئے، یہ مصاحب خاص تھا کیونکہ شوکن لوگ خود تلوار نہ اُٹھاتے تھے۔ اِسے کسرِ شان سمجھتے تھے۔ یہ جاگیردار لوگ بھی شوگن سے براہِ راست کلام نہ کر سکتے تھے۔ یہ وزراء کرام سے عرض معروض کرتے تھے۔ وہ آگے شوگن تک بات پہنچاتا تھا۔

قریب قریب ہمارے سیکریٹریٹ کا سا نظام سمجھئے کہ کلرک ڈپٹی سیکرٹری سے بات نہیں کر سکتا اور سیکشن افسر سیکرٹری سے بات نہیں کر سکتا۔ کلرک اپنی فائل سیکشن آفیسر کو پیش کرے اور سیکشن افسر ڈپٹی سیکرٹری سے رجوع کرے۔ وہ اچھے مُوڈ میں ہے تو چڑیا بٹھا کر فائل آگے بڑھائے ورنہ کونے میں ڈال دے۔ اِس سے معاشرے میں نظم وضبط قائم رہتا ہے۔ ہماری گائیڈ نے کہا کہ آپ سوچتے ہوں گے یہ سارے جاگیر دار جن کے پاس تلواریں ہیں، کہیں شوگن کو قتل وغیرہ کر دیں تو۔ یہ نہیں ہو سکتا تھا۔ شوگن کے چوب دار کے پیچھے ایک کھِسکنے والا دروازہ ہے۔ اُس کے پیچھے ہتھیار بند محافظ دستہ کھڑا رہتا ہے، جھری میں سے جھانکتا بھی رہتا ہے۔ جہاں کسی کی نیّت فاسد دیکھی، جھٹ سے بڑھ کر اُس کی بھٹّا سی گردن اُڑا دی۔ ایک کمرہ اسلحہ کے لیے مخصوص تھا۔ اُس میں کچھ لمبی توڑے دار بندوقیں بھی رکھی تھیں۔ گائیڈ نے بتایا کہ بندوق اُس وقت تک ایجاد ہو چکی تھی لیکن اُس کو بھرنا اور چلانا خاصا طویل عمل تھا۔ اِس لئے شمشیر زنی ہی کو ترجیح دی جاتی تھی۔ اُس سے آگے زنانہ یعنی محلسرا کا حصّہ شروع ہوتا تھا۔ اُس میں بھی کچھ مورتیاں نقشہ باندھنے کے لیے بِٹھا رکھی تھیں۔ یہ شوگن ہے یہ اُس کی رانی ہے۔ یعنی سرکار کی شریکِ حیات ہے۔ باقی حسینائیں وظائف تو وہی بجالاتی ہیں، ایک ذرا حقوق سے عاری ہوتی

ہیں۔ کنیزیں کہلاتی ہیں۔ ایک طرف کو ایک صاحبہ طنبورہ بھی گود میں لیے بیٹھی ہیں اور کھانے کے آداب بھی بتائے گئے ہیں۔ شوگن تک پہنچنے سے پہلے اُس کے مصاحب کھانا چکھتے تھے۔ چونکہ باورچی خانہ دور تھا۔ اس لیے وہاں تک آتے آتے ضرور ٹھنڈا ہو جاتا ہو گا۔ یہ بادشاہ کے لئے کھانا چکھنا اور اپنی جان کو داؤ پر لگانا ہمارے ہاں کی رسم بھی رہی ہے۔ نتیجتاً باغی امیروں کو حکومت بدلنے کے پُر امن اور صلح جویانہ طریقہ استعمال کرنے کی بجائے، جن میں زہر دینا بھی شامل ہے، تلوار اور تفنگ سے رجوع کرنا پڑتا تھا۔ اگر یہ بیچ میں کھانا چکھنے والوں کا کھڑاگ نہ ہوتا تو بہت سے انقلابات بلاخُون خرابے کے آ گئے ہوتے۔ اِن غُلام گردشوں کے فرش چلنے میں چرچر کرتے ہیں۔ فرش کے نیچے کیلوں کے بہم ٹکرانے کا ایسا انتظام رکھا ہے کہ بقول گائیڈ کے بُلبُل کے بولنے کی آواز آتی ہے۔ اِن فرشتوں کا نام ہی فرشِ بُلبُل رکھا گیا ہے۔ ہمارے ہاں فرشِ گُل تو ہوتا تھا۔ فرشِ بُلبُل جاپان والوں کی ایجاد ہے۔ ہمیں یہ کسی پرندے کی آواز تو ضرور معلوم ہوتی لیکن بُلبُل کی قسم ہم نہیں کھا سکتے۔ ویسے پنچ کہیں بلّی تو بلّی ہی سہی۔ بقول ہمارے دوست سیّد آفاق احمد کے، خاصی چکّر بازی ہے۔



ایک اور مندر دیکھا کہ آٹھویں صدی عیسوی کی یادگار ہے۔ یہ کیوموزو مندر کہلاتا ہے۔ بہت وسیع الشّان ہے۔ ستون وغیرہ اِس کے ٹھوس لکڑی کے ہیں۔ پہاڑی پر ہے اور اِس کا چھجّہ پہاڑی کے اوپر سے نکلا ہوا ہے۔ مرکزی دالان جس میں مہاتما

بدھ کی مورتیاں ہیں اور وسیع بر آمدہ ہر چہار طرف۔ یہاں سے پورا شہر کیوٹو دُور تک پھیلا ہوا نظر آتا ہے۔ یہاں فلک شگاف عمارتیں بہت کم ہیں۔ بڑے مندر کے اِرد گرد چھوٹے مندر بھی ہیں۔ ایک کو بے بی مندر کہیے۔ راستے نیچے چلے گئے ہیں۔ ایک جگہ کمہار کا آوا۔ خود کوزہ و خود کوزہ گر وفود گُل گوزہ۔ مندر کے صدر دروازے میں داخل ہوتے ہی لوہے کی دو تین بے ہنگم سی چیزیں نظر آئیں۔ ایک لمبا سا آہنی لٹھ، ایک جوڑا آہنی جوتوں کا، ایک اور موسل سا۔ لوگ اِن کو اُٹھانے اور چھُونے کی کوشش کر رہے تھے۔ قصّہ یہ معلوم ہوا کہ دور کسی گاؤں میں ایک لوہار تھا جس کو بینائی کا عارضہ ہوا۔ اندھا ہونے کا ڈر تھا۔ اُس نے خضوع و خشوع سے مہاتما بُدھ سے دُعا کی اور منّت مانی اور اُسے صحت ہو گئی۔ شُکرانے میں اُس نے یہ چیزیں لوہے کی اِس درگاہ پر چڑھائیں۔ خاصیت اِن کی یہ بتاتے ہیں کہ عورت چھُوئے تو برکت کا موجب ہو گا۔ زندگی بھر موزوں جوتوں کی فراوانی رہے گی۔ مرد چھُوئے تو اپنی بی بی کا غُلام ہو جائے۔ تا عُمر حکم عدولی نہ کر پائے گا۔ اِتنی بات سُن کر سب دُور دُور ہٹ گئے کہ ہاتھ کہیں اِس لوہے کے تبرّک پہ نہ پڑ جائے۔ ہمارے ساتھیوں میں صرف ایک ملائشیا کے حسن احمد تھے جو مال عرب پیش عرب کے طور پر اپنی بی بی کو ساتھ لیے پھِرتے تھے۔ ہم نے کہا اے میاں تُم تو ہاتھ رکھو۔ اُن کی بی

بی سے بھی کہا کہ اپنے میاں کو کھینچ کے لاؤ اور عُمر بھر کے لئے نچنت ہو جاؤ لیکن میاں حسین احمد وحشت زدہ ہو کر سب سے دور بھاگے اور اُن کی بی بی دانت نکالتی رہ گئیں۔

اِسی مندر کے ذرا نشیب میں ایک چشمہ ہے جس میں پرنالے لگا دیئے ہیں اور تین دھاریں پانی کی نیچے گرتی ہیں۔ ہماری گائیڈ نے بتایا کہ یہ پانی بڑی کرامت رکھتا ہے۔ پہلی دھار میں سے گھونٹ پیو تو خوش الحانی پیدا ہوتی ہے۔ دوسری دھار سے عقل اور ذہانت حاصل ہوتی ہے اور تیسرا پینے والے کی خوبصورتی کا ضامن ہے۔ اشتہاری زبان میں حُسن کا سِنگھار کہیئے۔ لوگوں کو فرداً فرداً اِن چیزوں کی ضرورت پڑتی ہے لیکن ہم نے اپنی ضروریات پر نظر کرتے ہوئے ایک ایک گھونٹ نہیں ایک ایک آئینہ مانگا اور حکمت کی کوئی بات سوچنے لگے۔ گلاس تینوں چشموں سے نوشِ جان کیا۔ اِس کے بعد فوراً ایک تان لگانے اور غزل گانے کی کوشش کی، آئینہ مانگا اور حکمت کی کوئی بات سوچ رہے تھے جس سے ہمارے غبی ہونے کی تردید ہو سکے کہ دوستوں نے کہا بھئی جتنی پُرانی شکایت ہو اتنا ہی وقت اِس کے علاج میں لگا کرتا ہے۔ اِس پانی کو اثر کرنے کے لیے کُچھ موقع دو۔ چندے انتظار کرو۔ پس آج کل ہم اِس پانی کو تاثیر کا موقع دے رہے ہیں اور انتظار کر رہے ہیں۔ اس امر کو

حُسن اتّفاقی ہی سمجھنا چاہیے۔ محلہ پیر گیلا نیاں لاہور کے شیخ غلام احمد کو جن کا اشتہار ”اِس کے پڑھنے سے بہتوں کا بھلا ہو گا“ آپ نے دیکھا ہو گا، اِعادۂ شباب کی مشہور دوا جو جنگل کی طلِسماتی جڑی بوٹیوں سے مرکّب ہے اِسی طرح اتفاقاً کھٹمنڈو میں ایک خضر صورت جوگی بابا سے ملی تھی۔



آئینہ مانگا اور حکمت کی کوئی بات سوچنے لگے

جاپان کی جبلیاں

جبلی مارنا پنجابی زبان کا محاورہ ہے۔ جبلی کا مطلب گپ سمجھتے۔ بے پَر کی سمجھئے۔ دیوانے کی بَڑ خیال کیجئے۔ اِس کا کُچھ تعلّق اُس جبلی سے نہیں ہے جو سِلور ہوتی ہے، گولڈن ہوتی ہے۔ کسی جارج پنجم کی ہوتی ہے۔ کسی حفیظ جالندھری کی ہوتی ہے۔ کسی فلم کی ہوتی ہے۔ ہڑبونگ کا مضمُون دونوں میں ہے۔ پنجابی کی جبلی کا تلفّظ کرتے وقت ج پر زیر ڈالنے کے علاوہ ج اور ب کے درمیان ہلکی سی بقدر ضرورت ھ بھی ڈالئے۔ یک چشمی یا دو چشمی یہ اپنے اپنے مذاق کی بات ہے۔ ایک اُستاد کا شعر کیا بے

موقع یاد آیا:

ہائے یہ حسرتِ دیدار مری ہائے کو بھی

ہائے دو چشمی سے لکھتے ہیں کتابت والے

ہم نے یہ عنوان اس لیے رکھا کہ آج کل کاموں کے اِس قسم کے عنوان رکھنے کا رواج ہے۔ اگر پنڈی کے بارے میں کالم ہے تو اس کا عنوان ہو گا NDI PATTER آغاز تو فیشن کے انگریزی رسالوں سے ہوا لیکن اب اُردُو میں بھی اِس قسم کی سُرخیاں نظر آتی ہیں۔ گوجرانوالہ کی گپ شپ، چیچہ وطنی کی چوں چوں، لاہور کی لَن ترانیاں، ٹنڈو آدم کی ٹرٹر۔ خیر پور کی خرافات، ہزارہ کی ہفوات، کوئٹہ کی کائیں کائیں اور بھلوال کی بھائیں بھائیں وغیرہ جاپان کی رعایت سے ہم جاپان کی جھک جھک یا جھائیں جھائیں لکھ سکتے تھے، لیکن یہ پنجابی کا لفظ بہتر معلوم ہوا۔ آج کا موضوع بھی متفرقات ہے کیونکہ اپنے سفر کے باب میں جو باتیں لکھنے کی تھیں، وہ ہم لکھ چکے بلکہ جو نہ لکھنے کی تھیں وہ بھی لکھ گئے، حتّٰی کہ ہمارے عزیز دوست جمیل الدّین عالی ہم پر خفا ہو گئے اور بذریعہ کالم ڈانٹ پلائی۔ ہم نے اُن کے ٹی وی پروگرام ”دُنیا پاکستان“ کی تعریف کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ایسا اچھا ٹھوس اور پاکیزہ

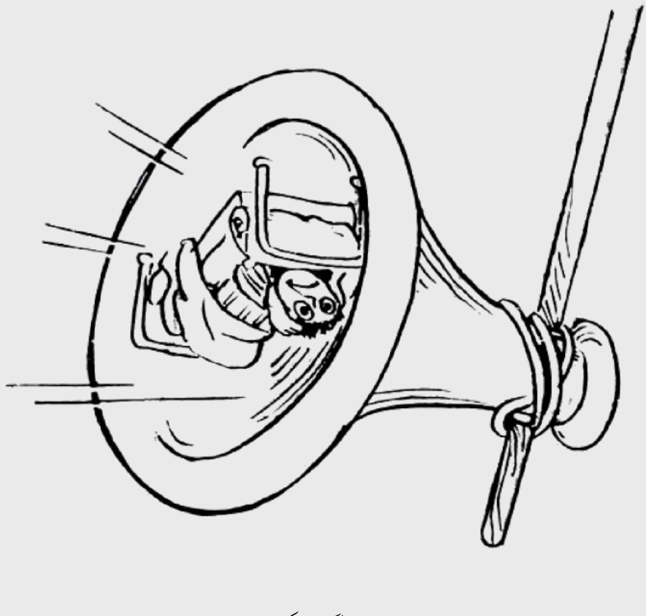
پروگرام جاپان والوں کو میسّر نہیں۔ بچاروں کو ااپی ایم جیسے لچّر اور حیا سوز پروگرام دِکھانے پڑتے ہیں اور ہمیں دیکھنے پڑتے ہیں۔ سُرخی یہ لگائی تھی کہ جاپان کو بھی ایک جمیل الدّین عالی کی ضرورت ہے۔ حاشا و کلّا ہمارا یہ مطلب نہ تھا کہ اُن کا پروگرام یہاں نہ دکھایا جائے، جاپان میں دکھایا جائے اور اُن کو یہاں نہ رکھا جائے، جاپان برآمد کر کے زرِ مبادلہ کمایا جائے۔ زرِ مبادلہ کی ضرورت کے باوجود ہمیں اُن کی فُرقت گوارانہ ہو گی۔ بہر حال یہ سوال اپنی جگہ میں ہے کہ جاپان والوں اور اہلِ فرنگ کی بے راہ روی کی اصلاح کون کرے۔ اِن کو نیکی اور ایمانداری اور دیگر اچھی اچھی باتوں کی تلقین کون کرے۔ یہ ہمارے اور شاہ بلیغ الدّین کے بس کی بات تو معلوم نہیں ہوتی۔

کوئی دو سال ہوئے ہم نے ذکر کیا تھا کہ جاپان کو گدھے چاہیں اور پاکستان کے چاہئیں۔ اگر گدھے ہوں لیکن پاکستان کے نہ ہوں یا پاکستان کے ہوں، لیکن گدھے نہ ہوں تو یہ اُن کی توقّعات کے خلاف ہو گا۔ اِن دنوں ہمارے ہاں گدھے بہت تھے اور ہر قسم کے تھے اور سچ تو یہ ہے کہ آج بھی ہیں اور ان کی کمی ہم نے کبھی محسوس نہیں کی لیکن جانے کیا بات تھی ہم اپنے اس دوست مُلک کی یہ ذراسی فرمائش پوری نہ کر سکے۔ ہمارے ذرا سے حجاب سے زرِ مبادلہ کا کتنا نقصان ہو گیا۔ ہم تو کہیں گے

کہ ہم نے بڑے گدھے پَن سے کام لیا۔ دیکھیے امریکہ کے لوگوں نے، کم از کم اِن کی ڈیموکریٹک پارٹی نے گدھے کا نشان بنایا ہے، یعنی گدھے کو سر آنکھوں پر بِٹھایا ہے۔ جب یہ کامیاب ہو جائیں گے تو بہت سے ترقّی پزیر مُلک، اِن کو باپ بنائیں گے۔ اِن کا رشتہ حضرت عیسیٰؑ سے ملائیں گے۔

وہ موقع تو خیر ہاتھ سے گیا حالانکہ جاپان والے ہمارے گدھوں کو آدمی بنا دیتے۔ اِس کے بعد اُن کی ہم جونپور کا قاضی بناتے یا نہ بناتے یہ ہمارا داخلی معاملہ تھا۔ ہم نے جاپان والوں کو پیشکش بھی کی تھی کہ تُم اپنے آدمی بھیجو، ہم اُن کو یہاں گدھا بنا کر واپس کر دیں گے۔ اور ہوتے ہوتے تم لوگ بھی گدھوں کے معاملوں میں خود کفیل ہو جاؤ گے۔ لیکن یہ بات اُن کی سمجھ میں نہ آئی۔ پھر ہم نے اونٹوں کے بھیجنے کی پیشکش کی، لیکن جاپانی لوگ یُوں تو بڑے ماہر ہیں۔ ہر طرح کی کلیں ٹھیک کر لیتے ہیں لیکن اونٹ کی کَل سیدھی کرنا اِن کے بس کی بات بھی نہیں۔ خیر وہ بات رفت گزشت۔ اب جاپان کی ایک بستی والوں کو مینڈک پکڑنے والوں کی ضرورت ہے اوساکا کے قریب ایک نئی بستی بنی ہے جس میں ایک جوہڑ ہے۔ اُس جوہڑ میں مینڈک ٹرّاتے ہیں اور بستی والوں کی نیند اُڑاتے ہیں۔ اندازہ ہے کوئی چھ ہزار ہوں گے اور فیملی پلاننگ کا محکمہ اُن کے پاس نہیں ہے۔ مہذّب مُلکوں میں آواز ہمارے

ہاں ریکارڈنگ کی بہتات کا بھی پیمانہ مقرّر ہے۔ اُس کو فون کہتے ہیں۔ ۴۵ فون سے زیادہ کی آواز شور سمجھی جاتی ہے اور بستیوں میں رات کو اِس کی اجازت نہیں۔ یہ ہم دوسرے مُلکوں کی بات کر رہے ہیں۔ ہمارے ہاں تو رات رات بھر کوئی تین سو چار سو فون کے آہنگ سے قوّالی ہوتی ہے، وعظ ہوتا ہے، ریکارڈ لگائے جاتے ہیں، بلکہ ہسپتال کے بے چین مریضوں اور امتحانات کی تیّاری کرنے والے طالبعلموں کو سُنوائے جاتے ہیں۔ اِس بستی میں مینڈکوں کے شورِ بے محابا کا اوسط ستّر پچھتّر کو پہنچ گیا ہے۔ شاہِ ایڈورڈ کی دُہائی ہے۔



ہمارے ہاں ریکارڈنگ کی بہتات

ہمارے ہاں ہر طرح کے پکڑنے والے موجود ہیں۔ سانپ پکڑنے والے۔ سانڈے پکڑنے والے۔ کُتّے پکڑنے والے۔ بِلّیاں پکڑنے والے۔ اُنگلی پکڑنے والے۔ پہنچا پکڑنے والے۔ حتّیٰ کہ آدمی پکڑنے والے۔ آدمی پکڑتے وقت تو یہ بھی نہیں پوچھتے کہ بتا تیری رضا کیا ہے۔ اگر اِن سب پکڑنے والوں کو پکڑ کر جاپان بھیج دیا جائے کہ جاؤ اور مینڈک پکڑو تو جاپان کے مسئلے تو حل ہوں گے ہی، ہمارے بھی بہت سے مسئلے حل ہو جائیں گے۔ ہم خُود چلے جاتے بلکہ وہیں رہ جاتے لیکن ہمیں سوائے عبرت پکڑنے کے اور کِسی قسم کا تجربہ نہیں۔ سواِس کا احوال ہم بیان کر چکے۔

ٹوکیو میں ہماری پرانی مونس و دم ساز گھڑی کا شیشہ ٹوٹا۔ ٹوٹا تو نہیں گِر گیا۔ اور اپنے ساتھ دھات کے اُس رِنگ کو لے کر گِرا جو اِسے اپنی جگہ پہ جماتے رکھتی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ آج کل ہم وقت کی قید سے آزاد ہیں۔ وہ گھڑیال جو یہ منادی دیتا تھا کہ گردوں نے گھڑی عُمر کی اِک اور گھٹا دی، وہ خاموش ہے۔ اور یہ حادِثہ وہاں ہوا ہے۔ جہاں گھڑیاں بنتی ہیں۔ یہ گھڑی یادش بخیر اب سے دس برس پہلے ہم نے ٹوکیو ہی میں خریدی تھی۔ ہمارے دوست سیّد علی احسن بنگال والے اور ہم ایک ہی میٹنگ میں گئے تھے اور وہی ہمیں ایک دُکان پر لے گئے تھے کہ ڈسکاؤنٹ ملے گا وہاں۔ ہم کھڑے باتیں کر رہے تھے کہ ایک صاحبہ آئیں اور انہوں نے اِن کی

داڑھی پکڑ کر ایک زور کا جھٹکا دیا۔ یہ کُچھ حیران اور کُچھ خفیف ہوئے۔ اُن صاحبہ نے بھی حیرانی کے ساتھ معذرت کی کہ ہیں یہ اصلی داڑھی ہے؟ میں سمجھی تھی نقلی ہے۔ اِن دس برس میں بہت پانی وقت کے پُلوں کے نیچے سے بہہ گیا اور علی احسن بھی اِس پانی میں بہہ کر جانے کہاں چلے گئے ہیں۔ اِس دوران میں ہم کئی بار جاپان آئے۔ کوئی اور گھڑی لے سکتے تھے لیکن یہ ہمیں عزیز تھی۔ کُچھ بدباطن اور بدزبان لوگ اِسے ہماری طبیعت کی خست بھی بتاتے ہیں اور اِسے بخل کا نام دے کر ہمارا جی دُکھاتے ہیں لیکن یہ بات نہیں ہے۔ گھڑی، کیمرہ، ٹیپ ریکارڈر، ٹیلی ویژن وغیرہ خریدتے وقت ہمیں خیال رہتا ہے کہ ہم کہیں ٹھگ نہ لیے جائیں۔ اِس احتیاط کا نتیجہ یہ ہوا کہ الحمدللہ ہم کبھی ٹھگے نہیں گئے۔ یہ اور بات ہے کہ آج بھی ہمارے پاس کوئی کیمرہ یا ٹیپ ریکارڈ یا ریڈیو وغیرہ نہیں ہے۔ جن صاحبوں میں ہم ایسا ضبط و تحمّل نہیں ہے اور ضرور خریداری کرنا چاہتے ہیں وہ ایک اصول گرہ میں باندھ کے جائیں جو اِن سردار جی نے باندھا تھا جو بیساکھی کے میلے میں لاہور آئے تھے۔ اُن سے کسی نے کہہ دیا تھا کہ دُکاندار جو قیمت بتائے، اُس کا آدھا بتانا۔ وہ چار مانگے تو تُم دو کہنا۔ انار کلی میں اُن کو ایک ٹائی نظر آئی۔ سردار جی نے دیکھا کہ اُس پر دس روپے قیمت لکھی ہے۔ فوراً کہا کہ میں تو پانچ روپے دوں گا۔ دُکاندار نے کہا۔ سردار

جی آپ ہمارے مہمان ہیں۔ یہ مُفت آپ کی نذر ہے۔ انھوں نے کہا۔ ”یہ بات ہے تو پھر میں دولوں گا۔“

جاپانیوں کی شائستگی، شیریں کلامی اور اخلاق کا ہم نے کئی بار تذکرہ کیا ہے۔ سچ یہ ہے کہ ایسی خلیق قوم ہم نے نہیں دیکھی۔ کسی ڈپارٹمنٹل اسٹور سے لفٹ میں سوار ہوئے تو اندر خوب صورت لڑکی آپ کو آداب کرے گی، برابر کچھ بولے جائے گی جس کا ہر فقرہ گزائی مس یعنی شکریہ پر ختم ہوتا ہے۔ دروازہ کھُلے کا تو ایک اور لڑکی دروازے سے باہر تک کہ آپ کو تسلیمات کرتی نظر آئے گی۔ اور یہ خوش خلقی صرف زبان کے الفاظ میں نہیں بلکہ چہرے مُہرے اور سارے جسم کی حرکات و سکنات میں ملے گی۔ آپ کہیں گے، یہ شائستگی تو کاروباری اخلاق ہوا۔ چیزیں جو بیچنی ہوئیں۔ ہم عرض کریں گے کہ یہاں چیزی نہ بیچنی ہوں وہاں بھی آداب ملحوظ رکھتے ہیں۔ یعنی کہ ظالم سماج سے بھی تُوتڑاق کا رواج نہیں ہے۔ ایک مثال ہے لیکن جی کو اداس کرنے والی۔ آج کے اخبار میں ایک خبر دیکھی کہ ایک قصبہ ہے ریشیتوما کی۔ اُس کے اسپتال کی تین اسٹوڈنٹ نرسیں ۱۴ مئی سے غائب تھیں۔ اُن کی لاشیں پورے دو ہفتے بعد ۲۸ مئی کو ایک جگہ سے ملیں۔ قصّہ یہ معلوم ہوا کہ اُن اللہ کی بندیوں نے جو ہاسٹل میں رہتی تھیں، دوست بنا رکھے تھے۔ کیونکہ بندہ بشر ہے اور

جوانی دیوانی ہوتی ہے۔ نتیجہ یہ کہ ہر روز رات کو بہت دیر سے آتی تھیں اور دروازے کی کُنڈی کھٹکھٹائی تھیں۔ ۱۴ مئی کو ہوسٹل کے سپرنٹنڈنٹ نے اُن کو فہمائش اور سرزنش کی کہ جلد آکر سویا کرو۔ اُن تینوں لاشوں کے ساتھ ایک رقعہ ملا ہے جس پہ مرقوم ہے۔

”جنابِ والا ہم آپ کو زحمت دینے کی معافی چاہتی ہیں۔ ہم لمبی اور ابدی نیند سونے جارہی ہیں اور آسمانوں سے آپ کی خُوشی اور خُرمی کا نظّارہ کریں گی۔

زیادہ حد آداب۔“

چل میاں ماسکو

ہم کسی نئے مُلک جاتے ہیں تو اپنے گھر سے وہاں کے دو تین لفظ لے کر نکلتے ہیں۔ سارا چین تین لفظوں میں گھوم گئے۔ نی ہاؤ یعنی آداب عرض یا مزاج شریف، شے نشے یعنی شکریہ، تیسرا اِس وقت یاد نہیں آ رہا۔ جاپان جانا سب سے زیادہ رہا، لیکن جو لفظ پہلی بار سیکھا تھا، آری گاتو گزائی مشتا اس سے آگے نہ بڑھے۔ اب جو ہم نے روس کا قصد کیا تو یہاں کے بھی دو ڈھائی ہی لفظ گرہ میں تھے ایک تو دا، یعنی ہاں، دوسرے نیّت یعنی نہیں۔ ایک لفظ دی وی دا بیا بھی کبھی سنا تھا لیکن اس کے متعلّق یقین نہ تھا

کہ خیر مقدم کے لئے بولا جاتا ہے، یا خُدا حافظ کے لئے۔ سلام دُعا کے لئے روسی لفظ بھی کسی نے بنایا تھا لیکن ہماری زبان پر نہ چڑھا۔ آخر یہی سوچا کہ گُڈ مارننگ سے کام چلائیں گئے۔ آخر انگریزوں نے اتنے دِن تک ہمارا نمک کھایا ہے۔ اُسے کُچھ نہ کُچھ تو حلال کرنا چاہیے۔ یہاں اگر ایک تو سپاسی با سیکھا یعنی شکریہ، غالباً سپاس نامے والے سپاس سے اِس کا تعلّق ہے۔ دوسرا اخراشو۔ اِن تین چار لفظوں سے ہم تا دمِ تحریر آٹھ دس دِن گزار چُکے ہیں اور کئی ہزار میل سوویت یونین کے اندر یعنی قزاقستان تک مار کر آئے ہیں۔ اُمّید ہے باقی دِن بھی بخیریت گُزر جائیں گے۔ اِس کے علاوہ اشاروں کی بین الاقوامی زبان سلامت رہے۔ ناشتہ مانگنے کے لئے بوفے کے کاؤنٹر کے سامنے قطار لگاتے ہیں اور اُنگلی کے اشارے سے کہتے ہیں کہ وہ دے دو۔ شروع شروع میں انگریزی میں Egg اور Bread وغیرہ کہتے تھے۔ جب دیکھا کہ انگریزی بھی اِن کے لئے اُردُو ہے، یعنی سمجھ بھی نہیں آتی تو خیال ہوا کہ پھر اپنی قومی زبان ہی کیوں نہ استعمال کی جائے۔ اب ہم بے تکلّف اُردُو میں کہتے ہیں۔ اے بی بی وہ ذرا میٹھی روٹی تو اُٹھا دینا۔ اے محترمہ، ذرا پنیر کا ایک ٹکڑا بھی عنایت ہو۔ چائے کو یہاں چائے ہی کہتے ہیں۔ دودھ اِس میں نہیں ہوتا۔ ایک روز ہمارا دودھ پینے کا جی چاہا چنانچہ اندازے سے ایک لمبی سی بوتل اُٹھائی۔ اپنی میز پر جا کر اُسے گلاس میں

اُنڈیلنے کی کوشش کی تو معلوم ہوا کہ دہی ہے۔ ناچار اس میں ہم نے نمک ڈالا، اور نوشِ جان کیا۔ آخر ایک صاحب سے دودھ کی روسی معلوم کرنی پڑی۔ ملاکو۔ ٹھنڈے اور گرم کی فرمائش اب بھی نہیں کر سکتے۔ اتنا تھوڑا ہے کہ دودھ مِل جاتا ہے۔ ہمارے دوست حسین شاہ راشدی اپنے چچا پیر حسام الدّین راشدی کی معیّت میں آج کل یہاں ہیں۔ اُن کو روسی میں ہمارا اُستاد جاننا چاہیے کہ خراشو کا لفظ اِنہی نے ہی سِکھایا ہے۔ وہ ادائے مطلب کے لئے یہاں زیادہ تر سندھی بولتے ہیں۔ لمبی چوڑی بات سندھی میں کہتے ہیں اِس آخر میں طراشو لگا دیتے ہیں۔ انگریزی یہاں اتنی ہی سمجھی جاتی ہے، جتنی اُردُو، اور سندھی۔ یعنی بالکل نہیں۔ پس

وفا کیسی کہاں کا عشق، جب سر پھوڑنا ٹھہرا

تو پھر اے سنگ دِل تیرا ہی سنگ آستاں کیوں ہو

عالی صاحب روس جا چکے ہیں۔ ایک بار نہیں کئی بار۔ اس کا سفر نامہ بھی رقم کر چکے ہیں۔ جس روزِ نیم شب کو ہمیں جانا تھا، آپ رات کو برستے پانی میں تشریف لائے۔ بولے وہاں کوئی لینے آئے گا؟ ہم نے کہا۔ ہاں یونیسکو کی میٹنگ ہے۔ ہم نے تار بھیج دیا ہے۔ اُن کا کوئی آدمی ہو گا۔ بولے۔ تار وہاں جاتا ہی نہیں۔ ہم نے کہا کیوں؟ پر

کُترنے کو لگی ہیں۔ قینچیاں دیوار پر۔ فرمایا تار ہفتہ بھر لیتا ہے، راستے میں ہمالیہ کا پہاڑ آتا ہے نا؟ ہم نے کہا جی نہیں پہنچ گیا ہو گا۔ اِس کے علاوہ سجّاد حیدر صاحب کو بھی خط لکھ دیا ہے جو ماسکو میں ہمارے سفیر ہیں اور جِن سے ہمارا نیاز مندی کا رشتہ ہے۔ وہ شاید کسی کو بھیج دیں۔ بولے میاں اتوار کے دِن صُبح کون اُٹھے گا۔ اور تمہارا خط وہاں کہاں پہنچا ہو گا۔ ہم نے کہا۔ کوئی بیس دِن پہلے ہم نے لکھ دیا تھا۔

بولے۔ ڈاک کا معاملہ گڑ بڑ ہے۔

ہم نے سراسیمہ ہو کر کہا۔ آپ ہمارے بزرگ ہیں۔ عمر میں ہم سے پانچ مہینے بڑے ہیں۔ آپ ہی بتائیں کیا کریں۔ وہ ہمارے ہتھیار ڈالنے پر خوش ہوئے۔ بولے بس تُم پہلے تو ہوائی اڈّے پہ ڈالروں کو روبل میں بھُنانا۔ جانتے ہو روبل کیا ہوتا ہے۔ انہوں نے ہمیں روبل کی تاریخ بتائی۔ اور کوپک کی اوقات بتائی کہ ایک روبل میں سو ہوتے ہیں۔ پھر فرمایا ہوائی اڈّے کے باہر آکر آواز دینا تاکسی، ٹیکسی مت کہہ دینا۔ تُم گنوار ہو اِس لئے خبردار کر رہا ہوں۔ وہاں انگریزی کوئی نہیں سمجھتا۔ مل گئی ٹیکسی؟ اس سے کہنا چلو پیکنگ ہوٹل۔ ہم نے ٹوکا کہ بالفرض ہمیں پیکنگ ہوٹل میں نہ ٹھہرنا ہو۔ فرمایا میں کون سا ٹھہرا رہا ہوں۔ راستہ بتا رہا ہوں۔ وہاں جا کر یوں کھڑے ہونا۔ اُنہوں نے میں ڈرل ماسٹر کے انداز میں کھڑے ہو کر دِکھایا اور فرمایا۔

یہ رہا تمہارا داہنا ہاتھ اور یہ رہا تمہارا بایاں ہاتھ۔ ہم نے قطع کلام کیا کہ ہمارا تو دہنا اور بایاں ہاتھ دونوں ہمارے پاس ہیں۔ یہ آپ کے ہیں۔ آپ کو غَلَط فہمی ہو رہی ہے۔ بہت ناخوش ہوئے۔ بولے بچّہ وہاں جا کر پریشان ہو گئے تو ہمیں یاد کرو گے۔ اچھّا کپڑے کیا کیا لے کر جا رہے ہو۔ ہم نے بتایا کہ ایک ہلکا سوٹ لیں گے ایک بھاری سوٹ اپنے بُقچے میں باندھ لیں گے۔ بولے ستمبر کا آغاز ہے۔ وہاں تو گرمی ہو گی بلکہ تُم تو جنوب میں الماتا جا رہے ہو۔ وہاں تو بالکل یہاں کی سی گرمی ہو گی۔ نکالو گرم سوٹ باہر اور رکھو اس میں بش شرٹ۔ میں تاشقند میں بش شرٹ ہی میں گھومتا تھا۔ ہم نے کہا اچھّی بات ہے۔ بولے۔ نہیں میرے سامنے نکالو سوٹ باہر۔ چنانچہ نکلوایا اور اُس میں بش شرٹ پتلون رکھوائی جو افسوس یہاں ہمارے کسی کام نہ آئی۔ عالی صاحب کی باتوں میں سے ایک بات سچ نکلی۔ ہمارے سفیر صاحب کو ہمارا خط ملا ہی نہ تھا۔ ہمارے ماسکو پہنچنے کے چار روز بعد ملا۔ لیکن خیریت ہوئی۔ یونیسکو والوں کو تار مِل گیا تھا۔ وہاں دو صاحبان لینے آ گئے تھے۔ نہ بھی آتے تو جہاز میں اکرم صاحب سے ملاقات ہو گئی تھی جو ماسکو میں کیمسٹری میں پی ایچ ڈی کر رہے ہیں۔ چھُٹّی گزار کر ماسکو واپس جا رہے تھے۔ کسٹم والے ماسکو میں بھی کراچی والوں کی طرح شریف اور مہربان ثابت ہوئے۔ لوگوں نے بتایا تھا کہ ننگا کر کے تلاشی لیں

گے۔ سوٹ کیس کو اُدھیڑ ڈالیں گے۔ جوتے کا تلا چاقو سے اُتار کر دیکھیں گے۔ کچھ بھی نہ ہوا بلکہ افسوس ہوا کہ ہم اپنے ساتھ کُچھ چرس اور کوکین وغیرہ کیوں نہ لیتے آئے۔

ایروفلوٹ کی پرواز بہت اچھّی ہوتی ہے۔ جہاز کے چڑھتے اُترتے وقت پتہ بھی نہیں چلتا۔ ہاں چند احتیاطوں کا مشورہ ہم مسافر کو دیں گے وہ یہ کہ کمبل تکیہ، ٹھنڈے پانی کی بوتل اور نمک وغیرہ اپنے ساتھ لے کر چلے۔ ہم رات کے دو بجے کراچی سے چلے تھے۔ جہاز پورا بھرا تھا۔ تھوڑی دیر میں ہم نے پانی مانگا تو جواب ملا پانی نیت NYET یعنی نہیں۔ سوڈا شربت پینا ہو تو البتّہ۔ ہماری آنکھ لگ گئی۔ تین بجے ظالموں نے جگا کر کھانا ہمارے سامنے رکھ دیا۔

ہم نے کہا یہ کیا ہے۔ سحری ہے یا افطاری ہے؟ اِن میں سے کسی کا وقت نہ تھا پس فرض کیا کہ تہجّد کا کھانا ہے۔ ہم نے کہا اے بی بی ہم اِس وقت نہیں کھائیں گے۔ ہاں صبح بریک فاسٹ مضبُوط دے دینا۔ معلوم ہوا بریک فاسٹ NYET نیت۔ اُترنے سے پہلے ناشتہ واشتہ نہیں ملے گا۔ ناچار ہم نے اُسے ٹھونگا اور فرمائش کی کہ کمبل عنایت ہو سردی شروع ہو رہی ہے۔ فرمایا کمبل بھی نیت NYET۔ کُل پچاس کمبل ہوتے ہیں۔ مسافر کوئی ڈیڑھ سو۔ جس کے ہاتھ آئے لے لے۔ چنانچہ لوگوں

نے لے لئے۔ ہمارے ساتھ کی سیٹ پر جو مسافر تھے وہ کلکتہ کے بنگالی تھے۔ اُن کا جہاز SAS خراب ہو گیا تھا، لہٰذا اُن کو اِس پر لاد دیا گیا تھا کہ ماسکو کے راستے اسٹاک ہام چلے جایئے۔ انہوں نے سگریٹ مانگے جواب ملا نیت۔ انہوں نے کہا میں خریدوں گا۔ زرِ مبادلہ نذر کروں گا۔ جواب پھر بھی صاف۔ البتّہ اُن کی بے چینی دیکھ کر ایک مسافر سے لا کر گولڈ لیف کا ایک سگریٹ اُن دیا۔ اب اُن صاحب نے کہا۔ شراب تو ہو گی۔ پیسے لے لیجئے۔ بولیں صرف فسٹ کلاس کے مسافروں کو دیتے ہیں اور البتّہ مُفت دیتے ہیں۔ انہوں نے اپنا ٹکٹ نکال دِکھایا۔ وہ فسٹ کلاس کا تھا۔ اِن بے چاروں کو ناحق ہماری کلاس میں بِٹھا دیا گیا تھا۔ وہ پریشان ہوئیں اور کہا۔ پہلے پتہ ہوتا تو آپ کو اچھّی سیٹ دیتی۔ خیر شراب لائے دیتی ہوں۔ ہم نے کہا ہمیں تکیہ تو دیجئے۔ سر کے نیچے رکھ لیں۔ یہ ہاتھ سو گیا ہے سرہانے دھرے دھرے۔ بولیں وہ بھی ہم صرف فسٹ کلاس کے مسافروں کو دیتی ہیں۔ ہمارے ہمسائے کو البتّہ ایک تکیہ لا دیا جو انہوں نے ہمیں پیش کر دیا۔ یہ تکیہ اس سائز کا تھا جیسا کسی نامولود کے لیے تحفے میں لاتے ہیں یا ذرا بڑے سائز کی گڑیا کے جہیز میں دیتے ہیں۔ ہم نے اِس کو غنیمت جانا اور آنکھیں بند کرتے ہوئے عرض کیا۔

تیرے زانو پہ میں سر رکھ کے ابھی سوتا ہوں

انقلاب آئے تو مُجھ کو بھی جگانا ساقی

لال چوک کے آس پاس

جانے سے پہلے ہم فیض صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے کہ آپ تو اِس دریا کی مچھلی ہیں۔ ہمیں روس میں کسی کا پتہ دیجئے۔ بولے ارے بھئی اپنے اشفاق مرزا ہیں نہ۔ جاتے ہی اُن کو فون کرلینا۔ ہم نے دریافت کیا اُن کا فون نمبر آپ کے پاس ہے؟ سگریٹ کو ڈبّی پر ٹھوکتے ہوئے بولے۔ پاس کیا معنی؟ زبانی یاد ہے۔ ڈائری نکالو، لکھو۔ فیض صاحب دُولے آدمی ہیں اور شاعری نے اُن کو مزید دُولا بنا دیا ہے۔ ہمارا خیال تھا کہ اِن کو کوئی بات کہاں یاد رہتی ہو گی۔ ایسا خیال رکھنے پر ہم دِل ہی دِل میں

شرمندہ بھی ہوئے اور نمبر نوٹ کیا ۳۳۔ ۳۳۔ ۲۹۱۔ ہوٹل میں پُہنچے ہی ڈائل گھمایا۔ صدائے بر نخاست۔ پھر گھمایا، پھر ہوں نہ ہاں۔ اتنے میں یاد آیا کہ چلتے ہوئے ایک فون نمبر اشفاق مرزا کا ملک نورانی نے بھی تو دیا تھا۔ وہ گھمایا تو کھٹ سے لگ گیا۔ بولے ٹھہرو ابھی آتا ہوں۔ ہم نے کہا۔ آنے سے پہلے یہ بتائیے کہ آپ فیض صاحب کے بتائے ہوئے نمبر پر کیوں نہیں بولے۔ پوچھنے لگے۔ وہ کون سا نمبر ہے۔ ہم نے بتایا تو بہت حیران ہوئے۔ فرمایا یہ کس کا نمبر ہے۔ میرا تو نہ یہ آج ہے نہ اِس سے پہلے کبھی رہا ہے۔ بد گمانی سی کر کے کہنے لگے۔ خُوباں میں سے کسی کا ہو گا اور یہ بھی ضروری نہیں کہ روس ہی کا ہو۔ فیض صاحب پچھلے دنوں بلغاریہ گئے تھے۔ وہاں کا کوئی نمبر کسی وجہ سے یاد رہ گیا ہو گا۔

پیر حسام الدّین راشدی کا پتہ مخدومی پیر علی محمد راشدی نے دیا تھا کہ روسیا ہوٹل کی گیارہویں منزل ہر ۲۷۰ نمبر کے کمرے میں ہیں۔ ہم تھوڑا ہنسے بھی کہ جب کمرے کا نمبر ہے تو گیارہویں منزل کی تخصیص کیا ہے۔ اب معلوم ہوا کہ وہاں ہر منزل پر ۲۷۰ نمبر کا کمرہ ہے۔ بلکہ یہ بھی پتہ کر کے چلنا چاہیے کہ یہ سب کُچھ اُس ہوٹل کے کون سے رُخ پر ہے۔ مشرق؟ مغرب؟ شمال؟ یا جنُوب؟ روسیا ہوٹل دُنیا کے سب سے بڑے ہوٹلوں میں سے ہے۔ چار ہزار کمرے اور کُچھ ہزار بیڈ۔ مع دیگر

متعلّقات کے سب کا عملہ فعلہ، کاؤنٹر، ریستوران، لفٹ الگ، روسیا کا مطلب ہے روس۔ اِس کا کُچھ تعلّق روسیا ہی سے نہیں ہے۔ حالانکہ آدمی ہمّت والا ہو تو یہاں بھی اِس کے سامان پیدا کر سکتا ہے۔ ہمیں دوسری منزل پہ ۲۴۶ نمبر کا کمرہ ملا۔ پیر صاحب تو اسپتال میں داخل تھے، چیک اَپ کے لئے اُن کے بھتیجے حسین نے قدم رنجہ فرمایا۔ ہم اُنہیں کراچی سے جانتے ہیں۔ بڑے صاحبِ ذوق آدمی ہیں۔ ایرو فلوٹ نے تو ناشتے کا نہ پوچھا تھا۔ حسین راشدی نے پوچھا۔ بولے سب سے پہلے یہی ہونا چاہیے۔ بھوکے بھجن نہ ہو۔ ہر دوسری منزل پر بوفے ہے جہاں پیٹ پوجا کا سامان ہے۔ لیکن کھڑا کھیل فرخ آبادی۔ حسین شاہ نے رہنمائی کی۔ دوا چائے (دوا کا مطلب دو) دوا ماسلہ (ماسلہ مطلب مکھّن) روٹی اور پنیر کی روسی ابھی انہیں نہ آتی تھی لہٰذا صرف اِشارہ کر کے کہا۔ دوا۔ دوا۔ اور خراشو۔ ناشتہ کے بعد وہ تو اسپتال چلے گئے۔ ہم نے کہا۔ ہم شام کو سفیر صاحب کے ساتھ جائیں گئے۔ بولے ہاں ٹھیک ہے۔ وہاں کی پابندیاں ہیں۔ یُوں ملنا مُشکل ہے۔ اِن کے جاتے ہی اشفاق مرزا آگئے۔ سفارت خانہ کے اقبال صاحب آگئے۔ سفیر صاحب نے از راہِ عنایت گاڑی بھیج دی تھی اور اکرم صاحب جن سے جہاز میں ملاقات ہوئی تھی اِن کے ساتھ تھے۔ اب تک معلوم ہو چکا تھا کہ ہم صرف ایک دِن کو ماسکو میں ہیں۔ کل الما تا یعنی

قزاقستان چلے جائیں گے جہاں وہ مذاکرہ ہے جس کے لئے ہم آئے ہیں۔ پس طے ہوا کہ جلدی سے جو جو کُچھ بھگتایا جا سکتا ہے، بھگتا لیا جائے۔

ماسکو میں بھگتانے کی سب سے پہلی چیز کریملین ہی تو ہے۔ ریڈ اسکوئر ہی تو ہے۔ ریڈ اسکوئر کا میدان ہمارے ہوٹل سے ملا ہوا ہی کہئے۔ یُوں تو پُرانی باقیات میں سے تین چار گرجا سمیت سنہری کلسوں والے ہمارے ہوٹل کے چہار طرف واقع ہیں۔ لیکن سینٹ باسل کا کتھیڈرل جو اپنی خوبصورتی اور زیبائی میں مشہورِ زمانہ ہے ریڈ اسکوئر کے ناکے پر واقع ہے۔ اِس کے آٹھ یا دس یا نہ جانے کتنے پیازی گُنبد ہیں جن پر رنگا رنگ لہریے ہیں۔ دیکھنے میں یہ پیران عظّام کے چھوٹے بڑے مخروطی عمامے نظر آتے ہیں۔ کُچھ نیچے کی سطح پر، کُچھ اُدھر کی سطح پر۔ پھر دریچے اور جھروکے۔ اُس کے اندر بھی گئے۔ دیواروں اور چھتوں پر حضرت یسوع مسیح اور ولیوں کی تصویریں۔ تنگ تنگ حُجرے۔ اِس سے نکلے تو پتھّروں کی چنائی والا سُرخ چوک، سُرخ کا مطلب سُرخ نہیں، نہ اِس کا مطلب کمیونزم وغیرہ ہے۔ یہ سُرخی پُرانی ہے اور خوبصورتی اور جلال کے معنوں میں ہے۔ ماسکو کی بُنیاد تو بارہویں صدی کے وسط میں پڑی اور یہ حکومت کا پایۂ تخت بھی رہا لیکن ۱۷۱۳ء میں پیٹر اعظم جن کا تفصیل سے ذکر ہم آگے چل کر کریں گے (اگر یاد رہا تو) دارالحکومت سینٹ پیٹرزبرگ

لے گئے۔ جو بعد ازاں پیٹرو گراڈ کہلایا اور انقلاب کے بعد لینن گراڈ ہوا۔ ۱۹۱۸ء میں حکومت ماسکو واپس آئی۔ کریملن پندرہویں صدی کی چیز ہے۔ بجائے خود ایک بڑی دُنیا ہے۔ اِس کے اندر محلات ہیں اور گرجا ہیں جس میں سے بعض اب سیّاحوں کے لئے کھُلے ہیں۔ ریڈ اسکوئر کے ایک ناکے پر تو یہ سینٹ باسل کا گرجا ہوا، دوسرے پر دور سامنے تاریخ کا عجائب گھر۔ بائیں ہاتھ کریملن کی فصیل اور بُرج جن میں پانچ بُرجوں پر سرِ شام سے سُرخ ستارے جھلملانے لگتے ہیں جو ماسکو کا نشان ہے۔ دیوارِ کریملن کے عین محاذی ایک لمبی چوڑی عمارت دفاتر کی اور دوسری گُم کے ڈپارٹمنٹل اسٹور کی۔ یہ مشہور اسٹور ہے۔ بہت بڑا۔ سُنا تھا اِس میں سوئی سے ہاتھی تک، ہر چیز ملتی ہے۔ یہیں تمہید ستانِ قسمت میں سے جانئے کہ نہ سوئی ملی نہ ہاتھی ملا۔ عمارت ڈھنڈار لیکن پُرانی وضع کی، غالباً انیسویں صدی کی۔ یہ انگریزوں کا چیمبر آف کامرس ہوا کرتا تھا۔ روس تو پسماندہ زرعی مُلک تھا۔ انگریز کارخانوں اور کوٹھیوں والے سامانِ تجارت لاتے تھے اور دولت سمیٹ لے جاتے تھے۔ کریملن کی دیوار کے ساتھ ایک لمبی بہت لمبی، کئی فرلانگ لمبی قطار نظر آئی جو چیونٹی کی رفتار سے رینگ رہی تھی۔ ہم نے پوچھا یہ کیا ہے۔ معلوم ہو مشتاقین کا ہجوم ہے۔ یہ سب لوگ لینن کے مقبرے میں حنوط شُدہ جسدِ خاکی کو دیکھنے آتے ہیں۔ لینن کا

درجہ یہاں بعد از خُدائے بزرگ کا نہیں ہے۔ اُس سے اونچا ہے۔ روسیوں کے لئے جو کچھ ہیں اوّل آخر یہی ہیں۔ ہمارے ساتھیوں نے کہا تُم دیکھو گے؟ ہم نے کہا ہاں لیکن چھ سات گھنٹے ہمارے پاس نہیں ہیں۔ اِس پر اقبال صاحب نے کُچھ اپنا اثر استعمال کیا۔ کچھ ہمارا تعلّق یونیسکو سے جتایا۔ بہرحال کسی کے دِل میں رحم آیا اور انہوں نے ہم تینوں چاروں کو عین بیچ قطار کے ایک جگہ داخل کر دیا اور یوں کوئی آدھ پَون گھنٹے میں ہماری باری گئی جو بصورتِ دیگر ناممکن بات ہے۔ یہ قطار آندھی بارش اور برف میں بھی لگی رہتی ہے۔ لینن کو دیکھنے کے لئے نیچے تہہ خانے میں جانا پڑتا ہے۔ اُن کے چہرے پر روشنی، چار سُو تقدّس کا عالم۔ لوگ خاموش، گویا یہ تھا اِس عظیم طاقت کا بانی جو سوشلزم کو کتابوں کے اوراق میں سے نکال کر عمل کی دُنیا میں لایا۔ آج آدھی دُنیا اِس کی حلقہ بگوش ہے۔ پانچوں برِّاعظموں میں اِس نام کا سِکّہ چلتا ہے اور دیکھئے تو کُچھ بھی نہیں۔ مُشتِ خاکی۔ قد عام آدمی سے بھی چھوٹا۔ لینن کا انتقال ۱۹۲۴ء میں ہوا تھا۔ جسدِ خاکی آدھی صدی سے زیارت گاہِ مشتاقان ہے۔ جب اسٹالین نے انتقال کیا تو اُن کی ممّی بھی یہیں رکھی گئی۔ لینن کے ساتھ ساتھ خروشیف نے آکر اسٹالین کی ہوا اُکھاڑ دی اور لاش اُٹھوادی لیکن کتنے دِن آپ جیا، کس لئے دارامارا۔ اسٹالین کا اسٹیچو لین کے مقبرے کے اندر نہ سہی، باہر کریملین

کی فصیل کے ساتھ کھڑا ہے۔ جا بجا اِس کی تصویریں بھی دیکھیں۔ گم گشتہ مقام تو ابھی نہیں ملا۔ لیکن لوگ تبرّا بھی نہیں بھیجتے۔ خروشیف کا مُردہ کہاں خراب ہوا کوئی نہ بتا سکا۔ بظاہر نہ فاتحہ نہ درود۔ تاریخ کو معروضی نقطۂ نظر سے دیکھئے تو اسٹائن کا بھی روس کو لوہالاٹ میں بڑا حصّہ ہے اور خروشیف نے بھی کُچھ کہا، روس کے لئے باہر کی ہوا کے دریچے کھولے۔ لیکن میاں آزاد۔ یہ فضول گُفتگُو ہے۔ یہاں کون دانیال انصاف کا ترازو لئے بیٹھا ہے۔

کریملن باہر سے دیکھ لیا۔ سینٹ باسل کا گِرجا اور لینن کا مقبرہ اندر سے دیکھ لئے۔ ہمارا اصول ہے کہ جو کام کل کیا جا سکتا ہے، اُسے آج کیوں کیا جائے۔ بھوک بھی لگ رہی تھی۔ اشفاق مرزا نے کہا۔، چلو باکو چلیں۔ ہم نے کہا۔ باکو نہیں۔ باکو تو آذر بائیجان میں ہے۔ ہم الماتا جا رہے ہیں، وہ بھی کل۔ بولے۔ باکو ریستوران کی بات ہے آج تمہیں وہاں کا کھانا کھلائیں۔ بشر طیکہ جگہ مِل جائے۔ جگہ یہاں کے ریستورانوں میں نہیں ملتی اور اکیلے دکیلے کو تو ویسے ہی انکار کر دیتے ہیں۔ ہاں بڑی منڈلی ہو تو جگہ نکال لیتے ہیں۔ باکو میں جو کُچھ کھایا مزے کا تھا۔ آذر بائیجان کا تھا۔ تنور کی موٹی خاص قسم کی روٹی تھی۔ شاشلیک تھا۔ شربت تھا۔ شاید لسّی بھی تھی اب کچھ یاد نہیں ہے۔ اُس دِن ہم نے آذر بائیجان کا کھانا کھایا، اگلے دِن میز بانوں

نے روسی کھانے کی دعوت کی، وہ بھی تکلّف اور مزے کی تھی اور تیسرے دِن ہم قزاقستان کے دستر خوان پر بیٹھے تھے۔ انسان بھی کیا پکھیرو ہے۔ کہاں کہاں جاتا ہے اور کہاں کہاں کا چوگا کھاتا ہے۔

چند دِن قزاقوں کے درمیان

ماسکو سے الماتا تیز رفتار جیٹ ہوائی جہاز سے پہنچنے میں پانچ ساڑھے پانچ گھنٹے لگتے ہیں۔ ۱۹۶۱ء میں جہاں گنتھر وہاں گئے تو انیس گھنٹے میں پُہنچے تھے۔ اُن کا جہاز کوئی اور ہو گا اور راستے میں ٹھہرتا گیا ہو گا۔ الماتا یعنی قزاقستان کا دارالحکومت جس کا ذکر مارکوپولو کے ہاں الماتو کے نام سے ملتا ہے، ہماری شمالی سرحدوں سے زیادہ دور نہیں۔ کوہ الطائی کے دامن میں واقع ہے جس پر آج کل بھی برف جمی ہوئی تھی۔ اِس سِلسِلۂ کوہ کو پار کریں تو چین کا صوبہ سنکیانگ آجاتا ہے اور شمال میں سرحد منگولیا

سے ملتی ہے۔ مسافت کا اندازہ اِس سے کیجئے کہ الماتا کا وقت ماسکو سے تین گھنٹے آگے ہے۔ جب کہ ہمارا وقت صرف دو گھنٹے آگے ہے۔ جب ماسکو میں نو بجتے ہیں، ہمارے ہاں گیارہ بجتے ہیں اور الماتا میں بارہ کا عمل ہوتا ہے۔ اِس پر تعجّب نہ ہونا چاہیے۔ سوویت یونین اپنی جگہ ایک برِّ اعظم بلکہ دُنیا ہے۔ اِس کے مغربی کنارہ پر جب شام ہوتی ہے تو مشرقی سرحدوں پر سورج طلُوع ہو رہا ہوتا ہے۔ مشرق میں اِس کے ڈانڈے جاپان سے ملتے ہیں اور مغرب میں فِن لینڈ اور پولینڈ۔ شمال میں یہ قطبِ شمالی کو چھُوتا ہے اور جنوب میں ایران، افغانستان وغیرہ سے شانہ بھڑاتا ہے۔ اِس وقت صرف ماسکو اور الماتا کی بات ہے۔ ماسکو سے خط سیدھا نیچے کھینچتے تو سعودی عرب میں سے گُزرے گا۔ الماتا سے عمود گرایئے تو دلّی پر آرہے گا۔ اب ہم اِس سرزمین کی طرف پرواز کناں تھے جہاں کے لوگ اپنی ترکتازی میں مشہور تھے۔ بھیڑوں کے گلے پالتے تھے اور موقع ملنے پہ قافلے بھی لُوٹتے ہوں گے۔ چنانچہ قزاق کا لفظ فارسی اور اُردُو میں آیا تو اِنہی معنوں میں آیا۔ الماتا میں ہم نے مشہور شاعر انور علیم جانوف سے پوچھا میاں معلوم ہے ہماری زبان میں تمہاری کیا اوقات مقرّر ہے۔ وہ پاکستان بھی آچکے ہیں۔ مُسکرائے اور بولے ہاں خوب معلوم ہے۔ لیکن یہ پرانی بات ہے۔ تُم آج کا نقشہ دیکھو۔

صاحبو۔ آج کا نقشہ یہی ہے کہ سوویت یونین میں جو پندرہ جمہورتیں شامل ہیں اِن میں رقبے کے اعتبار سے قزاقستان کا نمبر دوسرا ہے۔ دوسری مسلم جمہوریتوں تاجکستان ازبکستان ترکستان اور کرغیزیہ وغیرہ کو رقبے میں اِس سے کُچھ نسبت نہیں۔ اِس کا رقبہ ستائیس لاکھ سترہ ہزار مربّع کلومیٹر سے زیادہ ہے۔ آبادی رقبے کے معاملے میں زیادہ نہیں۔ ایک کروڑ ۴۰ لاکھ ہے۔ لیکن ایک عجب بات یہاں کی آبادی میں یہ ہے کہ اِس میں روسی نسل کے لوگ بہت ہیں۔ قزاقوں سے بھی زیادہ۔ روسی آبادی کا ۴۳ فیصدی ہیں اور قزاق ہیں ۳۲۔۵ فیصدی۔ دوسری مسلم جمہورتوں میں بھی روسی ہیں۔ لیکن اتنے نہیں۔ ازبکستان میں فقط ۱۲۔۵ فیصد، آذربائیجان میں دس فیصد، تاجکستان میں ۱۲ فیصد، ترکمانستان میں ۱۴۔۵ فیصد اور کرغیزیہ میں جو قزاقستان سے بھی جنوب میں ہے ۲۹ فیصد سے کُچھ زیادہ۔ اِن علاقوں میں روسیوں کا نفوذ کوئی انقلاب کے بعد کی بات نہیں۔ پچھلی صدی کے وسط سے روس کے حکمرانوں نے اِدھر قدم جمانے شروع کر دیئے تھے۔ کسی کو مفتوح بنایا کسی کو باج گزار۔ روس یہ نہ کرتا تو برطانیہ اِس کے لئے تیّار تھا۔ اُس نے اپنے جاسوس اور ایلچی اِدھر بھیجنے شروع کر دیئے تھے۔ دو صاحبوں کا احوال ہم نے پڑھا بھی ہے۔ کرنل سٹارٹ اور کیپٹن کونولی گئے اور امیر بخارا نے انہیں زنداں میں

ڈال دیا۔ ایک پادری جوزف وُلف خُدائی فوجدار بن کسان کو چھڑانے بھی گئے تھے۔ یہ بات ۱۸۴۲ء کے لگ بھگ کی ہے جب سندھ میں نیپئر صاحب کا ڈنکا بج رہا تھا۔ نیپئر نے بھی کُچھ دھمکی سی دی تھی کہ اگر کرنل سٹارٹ وغیرہ کو، جِن کے قید ہونے کی خبر آئی تھی، فوراً رہا نہ کیا گیا تو میں دھاوا بول دوں گا۔ اِن پادری وُلف صاحب کے جانے سے پہلے ہی امیر بخارا نصر اللہ بہادر کے حکم سے اِن دونوں ایلچیوں کی گردن ماری جا چکی تھی۔ خود وُلف صاحب بڑی مُشکل سے جان بچا کر بھاگے۔ یکّے بعد دیگرے یہ سارے علاقے روس کے زیرِ نگیں آ گئے تھے۔ اگر کوئی امیر تھا یا خان تھا تو بس نام کا امیر اور خان تھا۔ روسی انقلاب کے بعد بعض علاقے مقامی کمیونسٹ پارٹیوں کے زیرِ اثر از خود سوویت یونین میں شامل ہو گئے۔ بعض جگہ انگریزوں کے شسکارنے پر اور امیروں کے زیرِ اثر مزاحمت بھی ہوئی لیکن تابہ کے۔ ہم نے انور علیم جونوف سے کہا تُم لوگ کب سوویت یونین میں شامل ہوئے۔ اُس نے کہا ہمیں فخر ہے کہ ہمارے ہاں انقلاب روس سے پہلے آیا۔ ۱۹۱۶ء میں ہم نے زار شاہی کا تختہ اُلٹ دیا تھا اور خود مختار ہو گئے تھے۔ ۱۹۱۷ء میں روس میں لینن انقلاب لائے تو سب سے پہلا وفد جو اُن سے ملا وہ قزاقستان کا تھا۔ انہوں نے نئی اشتراکی ریاست میں شامل ہونے کی پیشکش کی اور لینن نے بہت خوش ہو کر اِن

لوگوں سے پورا تعاون بھی کیا۔ یہاں یہ بھی عرض کر دیں کہ اِن ساری مملکتوں کے مسلمان ہونے کے باوجود اِن میں باہم زیادہ خلوص نہ تھا۔ اکثر آویزشیں اور علاقوں کے جھگڑے رہتے تھے۔ بخارا و سمرقند والوں کی اپنے ہمسایوں ایران والوں سے بھی کبھی نہ بنی۔ جس کی ایک وجہ مذہبی اختلاف تھا۔ ہم الماتا کی مسجد تلاش کر کے امام صاحب سے ملے تو انہوں نے بتایا کہ اِن علاقوں کے سبھی لوگ سُنّی حنفی ہیں۔

جہاز میں ہماری اور ہندوستان کے ابو الحسن کی سیٹ کے درمیان ایک نوجوان آ کر بیٹھے۔ ترجمان آس پاس کوئی نہ تھا لہٰذا ایک لفظی مکالمے ہوئے۔ ہم نے فارسی آزمانی چاہی لیکن فارسی کا یہاں ایک لفظ نہیں سمجھا جاتا۔ چنانچہ ہمیں نام پوچھنے میں بہت وقت لگا۔ آخر ہم نے کہا دیکھو ہمارا نام یہ ہے۔ تمہارا نام بھی کُچھ ہو گا۔ ہمارا نام اُردو حروف میں لکھا اُس نے پڑھ لیا اور اپنا نام لکھ کر بتایا۔ قزبک قیوموف۔ قزبک تو کوئی قزاق نام ہو گا۔ قوموف کا مطلب قیّوم۔ اوف یہاں ہر نام کے پیچھے خواہ مخواہ لگتا ہے۔ بابا جان غفوروف بھی جو مشہور عالم میں اصل میں غفّور ہی ہیں۔ گویا یہ لڑکا مسلمان تھا۔ پاکستان کے نام پر خوش بھی ہوا۔ لیکن ہمارے مذاکرات زبان کی دقّت کی وجہ سے آگے نہ چلے۔ قریب نیم شب بشارت ہوئی کہ الماتا کا شہر آ گیا۔ یہ سچ مُچ روشنیوں کا شہر تھا۔ دُور میلوں تک روشنیوں کا اُجالا، چکا چوند۔ ماسکو کی نسبت

زیادہ۔ ہوائی اڈّے کی عمارت بھی زیادہ جدید اور پُر شِکوہ اور سڑکیں بھی زیادہ کُشادہ اور سبزہ بھی کہیں زیادہ۔ لوگوں کے چہروں میں بھی آشنائی کا روپ۔ الماتا کا پہلا تاثر ہی بہت خوشگوار تھا جس میں ہمارے چند روزہ قیام کے دوران میں کُچھ اضافہ ہی ہوتا رہا۔ جب ہم ہوٹل قزاقستان کے کمرہ نمبر ۲۴۶ میں آن کر اُترے تو رات کے ایک بجے کا عمل تھا۔ ماسکو میں پھل کہیں نظر نہیں آتا۔ یہاں ایک قاب رکھی تھی جِس میں سیب تھے اور انگوروں کے گچھے تھے۔ اور ایک بوتل معدنی پانی کی اور ایک بوتل غالباً دہی کی۔ سیب یہاں کے مشہور ہیں۔ الماتا کا مطلب ہی ابو السیب یعنی سیبوں کا باپ ہے۔ ہم نے آدھا سیب کھایا، چند انگور نوشِ جان کئے۔ ذرا کھٹّے تھے ورنہ سارے کھا گئے ہوتے۔ باقی معاملات کو کل پر رکھا اور کرسی کھینچ کے برآمدے میں بیٹھ گئے، جو ہوٹل کے عین سامنے کے رُخ پر واقع تھا۔ موسم بہت اچھّا تھا۔ اِکّادُکّا آنے جانے والوں کی سیر دیکھنے لگے۔

بدخشاں کی طرف رُخ کرنا

بہت دِن ہوئے مخدوم محیؔ الدّین کے ترجمے میں جمبول جابر کی ایک نظم پڑھی تھی:

؎ اے امیر اب نہ بدخشاں کی طرف رُخ کرنا

یہ انقلابی شاعر قزاقستان ہی کا رہنے والا تھا۔ الماتا کے آبائی قزاق اوپرا تھیٹر کے پاس پارک ہے اور پارک میں جمبول کا مجسمہ ہے۔ مرحوم نے شُہرت کے علاوہ عُمر بھی بڑی پائی۔ ۱۸۴۶ء میں پیدا ہوئے تھے۔ ۱۹۴۵ء میں دوسری جنگِ عظیم کو بھگتا

کر فوت ہوئے۔ آج ہمارا رُخ بدخشاں کی طرف تھا۔ لیکن ہم امیر نہیں تھے۔ جمبول سے بھی زیادہ یہاں جِس شاعر کو مانتا ملی اور جسے قزاق شاعروں کا بابا کہنا چاہیے اُس کا نام آبائی کنن بائیف ہے۔ بائیف تو روسی کا لاحقہ ہوا۔ اصل نام آبائی کنن بابا یا قانون بار رہا ہو گا۔ اِن کی نظموں کے انگریزی تراجم کا مجموعہ ماسکو سے چھپ چُکا ہے۔ اِن کا زمانہ ۱۸۴۵ سے ۱۹۰۴ء تک کا ہے۔ گویا پیدائش اُن کی جمبول کے ساتھ ساتھ ہوئی ہاں اتنا نہ جئے۔ روسی انقلاب دیکھا نہ کوئی عالمی جنگ دیکھی۔ اِن کے نام پر سڑکیں چوک تھیٹر وغیرہ بہت کُچھ ہے۔ آج کل شاعری کے اچھّے مترجم نہیں ملتے۔ اصل قزاق زبان میں اِن کا کلام ضرور زور دار رہا ہو گا۔ پہلے اِس زبان کا رسم الخط یہی نسخ ہی تھا۔ انقلاب کے چند سال بعد تک رہا۔ اب روسی حروف میں لکھتے ہیں۔ فرینڈ شِپ ہاؤس کے احاطے میں ایک صاحب نے کتابوں کی نمائش برپا کر رکھی تھی۔ نام اِن کا پوچھا تو معلوم ہوا رمضانوف ہے یعنی رمضان۔ ہم نے دریافت کیا میاں رمضانوف کیا کبھی رمضان شریف کے روزے بھی رکھے۔ آج کل بھی تو رمضان کے دِن ہیں۔ لیکن وہ انگریزی نہ سمجھتے تھے۔ انگریزی سمجھتے بھی تو ہماری بات جانے سمجھتے یا نہ سمجھتے۔ اِس نمائش میں فارابی کے کُچھ رسائل کے روسی اور قزاق ترجمے پڑے تھے۔ اصل نام اِن رسالوں کے عربی رسم الخط میں بھی دیئے

تھے لیکن رمضانوف صاحب اِن کو نہ پڑھ سکے۔ یہاں کتابیں چھپتی ہیں اور چھپتے ہی بِک جاتی ہیں۔ ہم نے ایک دو کتابوں کا نام لیا جو روس میں چھپی ہیں۔ نہ ماسکو میں مِلیں نہ الماتا میں۔ ساتویں ستمبر کو آبائی قزاق اوپرا ہال میں ہم نے ایک کنسرٹ دیکھا۔ ہم سمجھے روایتی پوشاک اور روایتی انداز میں ہو گا۔ بالکل مغرب کا نقشہ تھا۔ ہال کھچاکچھ بھرا تھا۔ خاصی نغمہ طرازی ہوتی رہی۔ اِن نغمہ طرازوں میں صرف گُل بی بی یاد رہ گئی ہیں۔ شاید اِس لئے کہ فردوس گوش ہونے پر اِکتفانہ کرتی تھیں جنّت نگاہ وغیرہ بھی تھیں۔ ہمارے ہاں اچھّے گانے پر بیل دیتے ہیں۔ وہاں تالیاں بجاتے اور پھُول پیش کرنے کا دستور ہے۔ گُل بی بی طرح طرح کے گُلوں سے لاد کر گُلزار بی بی ہو گئیں۔

یاد رہے کہ الماتا کوئی بخارا و سمرقند کی طرح کا پُرانا شہر نہیں کہ آثارِ صنادید سے مالا مال ہو۔ الماتو نام کے شہر یا قصبے کا ذکر مارکو پولو کے ہاں رہا ہو تو رہا ہو فی الحال یہاں کوئی عمارت سو پچاس برس پرانی بھی دِکھائی نہیں دیتی۔ پہلے شہر اُجڑ گئے یہ نیا الماتا کوئی دو سو برس پہلے آباد ہوا۔ پھر یہاں زلزلہ آیا بلکہ زلزلے آئے۔ ایک زلزلہ ۱۹۱۰ء میں آیا جس میں سارا شہر کھنڈر ہو گیا۔ فقط ایک مسجد بچّی اور ایک گرجا بچا۔ ہم نے معنی خیز نظروں سے یہ کتھّا کہنے والے کی طرف دیکھا تو بولا۔ پھر مسجد بھی

آگ میں جل گئی۔ بس گرجا رہ گیا ہے۔ یہ یہاں کی سب سے پُرانی عمارت ہے۔ ہم نے مسجد بھی جا دیکھی اور گرجا کو بھی دیکھا لیکن باہر سے یہ سر تا سر لکڑی کا بنا ہوا ہے۔ خاصا شاندار۔ دُنیا میں دوسری سب سے بڑی چوبی عمارت میں شمار ہوتا ہے۔ پہلا نمبر جاپان میں نارا کے ایک بودھ مندر کا ہے۔ اتّفاق سے وہ بھی ہم نے دیکھ رکھی ہے۔ الماتا کے اِس گرجا کی تعمیر میں کہیں کوئی آہنی یا برنجی کیل استعمال نہیں ہوئی۔ چوبی میخوں سے کام لیا گیا ہے۔ آج کل اِس میں ایک میوزیم ہے۔ لیکن پاڑ بندھی تھی۔ مرمّت ہو رہی تھی۔ اندر سے ہم اِسے نہ دیکھ سکے۔ مسجد سارے شہر میں ایک ہی ہے۔ ہم اور ہمارے دوست ابوالحسن جو دہلی سے آئے تھے ڈھونڈتے ڈھونڈتے پُہنچے۔ باہر ایک پھاٹک۔ اندر ایک احاطہ۔ دُور جا کر پیش امام کا کمرہ۔ اِن لوگوں نے مسجد میں پہلے سے فون کر رکھا تھا۔ پہلے تین چار چگی داڑھی والے خدّام ملے۔ پھر امام صاحب اپنے عمامے اور عبا اور لمبی داڑھی میں بر آمد ہوئے۔ ہماری فارسی یہاں بھی نہ چلی۔ براہ راست گفتگو صرف الحمدللہ وغیرہ تک محدود رہی۔ ہم پوچھنے کو تھے کہ آپ عربی جانتے ہیں۔ کُچھ سوچا کہ اگر واقعی عربی جانتے ہوئے اور بولنے لگے تو ہم کیا کریں گے۔ نماز کا یہ وقت نہ تھا۔ مل کر دُعا پڑھی۔ عمارت یہ بھی لکڑی کی مسطّح چھت والی نظر آئی۔ گنبد و مینار ہم نے نہ دیکھے۔ دیواروں پر آیتیں

اور طغرے، وسعت خاصی، ساری مسجد میں قالینوں کا فرش۔ باہر ایک صندوقچی بھی دیکھی۔ یہ مسجد ایمان والوں کے چندے سے چلتی ہے۔ کوئی سرکاری مدد یا وظیفہ اِسے نہیں ملتا۔ ہم نے پوچھا کتنے لوگ نماز کو آتے ہیں۔ معلوم ہوا کوئی ستّر آدمیوں کی جماعت ہو جاتی ہے۔ جمعہ کو چار پانچ سو۔ بقر عید پر کچھ اور زیادہ ہو جاتے ہوں گے۔ ہمارے ساتھ ایک مقامی قزاق ترجمان بھی تھے۔ اُن سے کُرید کی تو کہنے لگے۔ بس بُڈھے لوگ مسجد جاتے ہیں۔ ہمیں توفیق نہیں۔ ہاں کھانے پر بیٹھتے ہیں تو بسم اللہ پڑھتے ہیں۔ نکاح بھی ہوتا ہے۔ ختنے وغیرہ کا بھی ہم نے بہانے بہانے پوچھا۔ کراتے ہیں۔ لباس مغربی بھی ہو تو ٹوپی ضرور اپنی منقّش اور روایتی طرز کی رکھتے ہیں۔ ایک ٹوپی ہمیں بھی تحفے میں ملی۔ اِسے سر پر رکھ کر ہم بھی قزاق معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن اُردُو فارسی معنوں میں۔

ماسکو خوبصورت ہے لیکن لینن گراڈ خوبصورت تر ہے۔ جس کسی سے بھی پوچھئے یہی کہے گا لیکن آج کل کے پیمانے سے دیکھئے تو الما تا خوبصورتی میں اِن سے کہیں آگے ہے۔ چوڑی چوڑی سیدھی سڑکیں۔ سیدھی رَوش سبزہ و گُل کی بہتات۔ باغ، پارک، عمارات وغیرہ۔ شہر سے باہر اِن کا اسٹیڈیم بھی دیکھنے گئے جو عین دامنِ کوہ میں واقع ہے اور جہاں برف پر اسکیٹنگ کرنے کا رِنگ ہے۔ یہ یہاں کا الپس ہے۔

جسے الطائی کے نام سے ہم جانتے آتے ہیں۔



ایک ٹوپی ہمیں بھی تحفے میں ملی

یہاں کی عظیم الشّان عمارتوں میں ایک لینن پیلس ہے۔سچ یہ ہے کہ اِس شان و شکوہ کی عمارت ہم نے کم ہی کہیں دیکھی ہے۔اِسے مکمّل ہوئے چند سال ہو چکے۔ بین الاقوامی بڑے اجتماعات کے لیے بہت موزوں ہے۔ویسے روزمرہ اِس میں تھیٹر ہوتا ہے۔ یہاں کے لوگ تھیٹر اوپرا وغیرہ کے بہت رسیا ہیں۔ اِس عمارت کی زیبائی ہماری آنکھوں میں ہے، لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ الفاظ میں اِس کی رِفعت و وُسعت کو کیسے بیان کیا جائے۔ تین ہزار سیٹیں ہیں۔ بین الاقوامی جلسہ ہو تو چھ زبانوں میں بیک وقت ترجمے کا بھی اِس میں اِنتظام ہے۔ہم یہاں کی رائٹر یونین کے دفتر میں گئے۔یہ عمارت بھی شاندار ہے۔ہال میں چار سو سیٹوں کا انتظام ہے اور چار سو ہی ممبر ہیں۔ اِس سے زیادہ نہیں بنائے تاکہ مزید کُرسیوں کا انتظام نہ کرنا پڑے۔ انور علیم جانوف بڑی موہنی شخصیت کے آدمی ہیں۔ ہمیں گھر بھی لے گئے۔ایک قزاق خنجر تحفے میں دیا۔اِسے ہم سوٹ کیس میں رکھتے ہیں۔بریف کیس میں رکھیں تو فوراً شُبہ ہو کہ جہاز ہائی جیک کرنے کا ارادہ ہے۔کِسی اور کو ہو نہ ہو ہمیں خود تو ضرور ہو۔

ایک دِن علی الصبح ہم ترجمان کو لے کر سبزی منڈی دیکھنے نکل گئے۔کِسی مقام پر صفائی کا اندازہ کرنا ہو تو سبزی منڈی کو دیکھ لو۔ صاحبو۔ یقین کرو۔ ایسی صاف

سُتھری جگہ ہم نے دُنیا بھر میں کہیں نہیں دیکھی۔ نہایت قاعدے کے صاف اور مجلّا اسٹال لیکن جو سلیقہ ترتیب سے چیزیں سجانے کا دیکھا خواہ وہ پیاز یا کھیرے یا دھنیا ہی کیوں نہ ہو۔ ہم اِس کی بات کر رہے ہیں۔ بیچنے والوں میں دیہاتی عورت مرد زیادہ تھے۔ کُچھ قزاق لیکن ایک بڑی تعداد کورین لوگوں کی۔ کوریا کے لوگوں کی آبادی قزاقستان میں خاصی ہے۔ یہ لوگ کب آئے، کیسے آئے، کیوں آتے یہ ہم نہ پوچھ سکے۔ اِن کے علاوہ جا بجا جپسی عورتیں، خانہ بدوش۔ یہ لوگ اپنے گھروں کے احاطوں میں سبزی یا پھل اُگاتی ہیں۔ گھروں میں پنیر وغیرہ بناتی ہیں اور یہاں بیچنے کو لاتی ہیں۔ یہ اِن کی اضافی آمدنی کے لئے۔ اِس کی کوئی حد نہیں۔ آپ چاہیں تو کار خرید لیں۔ لیکن یہ جُرم ہے کہ سبزی اُگائے کوئی اور بیچے کوئی۔ آڑھتی یا بیچ کے دُکاندار کا کوئی کام نہیں۔ گوشت کی مارکیٹ بھی اِس احاطے میں تھی۔ وہاں بھی صفائی کا یہی عالم۔ ایک جگہ چند خرگوش بھی چھِلے چھلائے رکھے تھے۔ فرش پر ایک بھی پتّہ یا کاغذ کِرا نہ دیکھا۔ پھلوں میں یہاں کا سردا اور خربوزہ مشہور ہے۔ مزے کا ہوتا ہے۔ ماسکو والے اِس کو ترستے ہیں۔ لانے کی فرمائش کرتے ہیں۔

الماتا میں سڑکوں کے دونوں طرف کھُلی نالیاں ہیں۔ جیسی ہمارے ہاں چھوٹے شہروں میں رواج تھا بلکہ اب بھی ہے لیکن پانی کے نکاس کا عمدہ انتظام ہے۔ کہیں

گندگی نہ دیکھی۔ اب پت جھڑ کی آمد آمد تھی۔ درخت پیلے اور سُرخ ہو رہے تھے۔ رُخصت ہونے کے لئے گاڑی میں بیٹھے تو قزاقستان لٹریری گزٹ کا تازہ شمارہ کسی نے دیا جس میں ہمارا حال احوال انٹرویو وغیرہ مع تصویر کے دیکھا۔ ہم نے تہہ کر کے رکھ لیا۔ ماسکو میں کسی سے پڑھوا کر دیکھیں گے اور خوش ہوں گئے۔ ماسکو میں کوئی قزاق ہمیں نہ ملا۔ ہمارے پڑھنے والوں میں کوئی قزاق ہو تو ہاتھ کھڑا کرے۔

کُچھ متفرقات: سفرِ روس کے

(۱)

چند سال اُدھر ہم جرمنی گئے تھے تو اپنے سلیپنگ سوٹ کا اُوپر کا حصّہ ہیمبرگ کے ایک ہوٹل میں اٹکا چھوڑ آئے تھے۔ اب کے ماسکو سے چلے اور الماتا پُہنچے تو معلوم ہوا کہ دوسرے سلیپنگ سوٹ کا نیچے کا حصّہ یعنی پاجامہ ہوٹل روسیہ کے کمرہ ۲۳۸ کے غُسل خانے میں رہ گیا ہے۔ گویا دمِ تحریر ہمارا پورا ایک سلیپنگ سوٹ یورپ

میں موجود ہے۔ آدھا آزاد اور سرمایہ دار دُنیا میں۔ آدھا سوشلسٹ دُنیا میں۔ جب کہ ہم خود جیسا کہ آپ جانتے ہیں تیسری دُنیا میں ہیں کوئی بات نہیں۔ ہم مشرق کے مسکینوں میں سے ہیں، لنگوٹی باندھ کر سولیں گے۔ ہمارے کپڑے، سرمایہ دار اور سوشلسٹ دُنیا والے شوق سے پہنیں، ہماری طرف سے اجازت ہے۔ البتّہ ماسکو والوں سے گزارش ہے کہ ہمارے پاجامے کو دھوبی کو نہ دیں، بھٹّی پر نہ چڑھائیں۔ گھر پہ دھوئیں کیونکہ اِس کا رنگ کچّا ہے۔ جس طرح ہمارا اپنا رنگ کچّا ہے۔ ہاتھ لگانے سے چھُوٹتا ہے۔

(۲)

ہم نے ماسکو میں اشفاق مرزا سے پُوچھا کیوں صاحب۔ روس اتنا بڑا مُلک ہے۔ یہاں بھی سندھی، پنجابی اور مقامی مہاجر کا قصّہ چلتا ہوگا۔ بولے لطیفوں کی حد تک تو چلتا ہی ہے۔ مثلاً آرمینیا بھی سوویت یونین میں ہے اور جارجیا بھی۔ جہاں جارجیا کے لوگ بڑے فیاض اور کھُلا خرچ کرنے والے گِنے جاتے ہیں، آرمینیا والوں کو بنیا اور کنجوس سمجھا جاتا ہے۔ لطیفہ ہے کہ ایک آرمینی اندھیرے میں کُچھ ڈھونڈ رہا تھا۔ جارجیا کے ایک خوش فکرے سے پوچھا۔ اے برادر کیا ڈھونڈ رہے ہو؟ اُس نے کہا

خاصا نقصان ہو گیا۔ پانچ روبل کا نوٹ تھا جو ِگر گیا ہے۔ جار جیا والے نے جھٹ دس روبل کا ایک نوٹ نکالا، ماچس سے اُسے آگ دِکھائی اور کہا لو میں روشنی کیے دیتا ہوں۔ ڈھونڈ لو۔



دس روبل کا نوٹ نکالا اور اسے آگ دکھائی

آگے کی بھی سُنیے۔ دونوں ایک تھیٹر دیکھنے گئے۔ اوور کوٹ باہر چوکیدار کے سپُرد کر گئے۔ تھیٹر ختم ہونے پر آرمینی نے اپنی شہ خرچی کا رُعب ڈالنے کے لیے چوکیدار سے کوٹ لیا اور اُسے پانچ روبل ٹِپ میں دیے۔ جار جیا والے نے بٹوہ نکال کر اُسے

دس روبل دیے اور کہا کوٹ کی ضرورت نہیں۔ وہ بھی تُم ہی رکھ لو۔

(۳)

الماتا کو ہم تو الماتا ہی لکھتے ہیں۔ لیکن ایک اُردُو کتاب کے نقشے میں الماعطا بھی لکھا دیکھا۔ اِس سے عطا میں تو معنی پیدا ہو گئے۔ لیکن ایک ع اور ڈال دیا ہوتا تو اور اچھّا ہوتا۔ علماعطا میں جو عِلمی شان ہے وہ نہ صِرف محسوس کی جا سکتی ہے بلکہ دیکھی بھی جا سکتی ہے۔ الما اور الم کی املائیوں بھی نامبارک ہے۔ جو لوگ عطائی کو اتائی لکھنے کی تلقین کرتے ہیں۔ اِن سے ہمیں اختلاف ہے۔ اُردُو کے بعض حروف ایسے ہیں کہ اِن میں اسلامی اور علمی شان پائی جاتی ہے۔ بچپن میں دوسری تیسری جماعت میں ہم سکندرِ اعظم کو مسلمان سمجھا کرتے تھے۔ اسی طرح ارسطو، افلاطون، فیثا غورث اور بطلیموس وغیرہ کو بھی کیونکہ اِن ط ظ کے ناموں والے کم از کم ہندو نہیں ہو سکتے تھے۔ ہمارے دیہات میں عیسائی یا کسی اور مذہب والا کوئی نہ تھا۔ پس جو ہندو نہیں وہ مسلمان تھا اور جو مسلمان نہیں وہ ہندو تھا۔ ہم اندر ہی اندر خوش ہوتے تھے کہ سکندرِ اعظم نے پوری دُنیا کو شکست دی۔ پورس کی شکست سے ہمارے ہندو ہم سبق بہت چِڑتے تھے۔ چنگیز خاں اور ہلاکو خاں میں تو لفظ خان ہی کہے دیتا ہے کہ یہ لوگ

مسلمان تھے بلکہ پٹھان تھے۔ روس میں قزاقستان میں تو انور اور قیّوم رمضان اور عبد اللہ وغیرہ نام سُنتے ہی تھے۔ بخارا اور سمرقند جا پاتے تو مزید سُنتے لیکن ماسکو اور لینن گراڈ میں بھی کئی بار خیال آیا کہ یہ پورا مُلک مسلمان ہو سکتا تھا۔ اگر اب اِس اگر کا قصّہ سُنیے۔ دسویں صدی عیسوی کے آخر کی بات ہے کہ کیف میں جو روس کا دار الحکومت ہوا کرتا تھا ایک بادشاہ تھا جس کا نام باسل تھا۔ مذہب اُس کا کُچھ نہ تھا۔ پیگن یعنی کافر تھا۔ باز نطینی اثرات کے تحت اُس نے فیصلہ کیا کہ کُفر کو چھوڑ کر کوئی مذہب اختیار کیا جائے لیکن کون سا؟ یہودیت؟ اسلام یا عیسائیت؟ ایک دور میں اُس کا رُحجان اسلام کی طرف بہت زیادہ تھا بلکہ وہ مسلمان ہونے ہی والا تھا کہ کِسی نے بھانجی مار دی اور کہا کہ مسلمانوں میں شراب نوشی کی اجازت نہیں۔ ہم جیسا مبلّغ ہوتا تو اُسے تھوڑی رعایت دیتا کہ میاں کوئی بات نہیں چھُپ کر پی لیا کرنا، تھوڑی پی لیا کرنا۔ آخر اِس زمانے کے دوسرے مسلمان حکمرانوں میں سے اکثر پیتے ہی تھے اور کھُلم کھُلا پیتے تھے۔ لیکن موصوف بِدک گئے اور عیسائیت اختیار کی۔ ولاڈی میر کے نام سے مشہور ہوئے اور روسی آرتھوڈکس چرچ کے پہلے ولی بھی کہلائے۔ شراب واقعی بڑی خانہ خراب چیز ہے، امّ الخبائث ہے۔ یہ نہ ہوتی تو اپنے بادشاہ کے پیچھے پیچھے آج سارا روس مسلمان ہوتا۔ ولی ولاڈی میر اور معاملوں میں

بھی بڑے پُہنچے ہوئے تھے۔ اُن کے حرم میں آٹھ سو بیگمات تھیں۔

(۴)

ماسکو کے جس مدرسے میں اُردُو پڑھاتے ہیں، وہاں تو ہم جا نہ سکے۔ وہاں کے اُستاد پروفیسر سخاچوف صاحب مہربانی کر کے خود ہی ہم سے ملنے ہوٹل آ گئے تھے۔ اُن کا مطالعہ بہت اچھا ہے۔ اِس مدرسے کے فارغ التحصیل طلبا سے البتّہ ملنا ہوا۔ یہاں بھی وہاں بھی۔ بڑی محنت سے سیکھتے اور بولتے ہیں۔ مادام سلقانیک بھی جو وہاں کی رائٹرز گلِڈ کی پردہان ہیں۔ صدر کے معنوں میں نہیں، اہمیت کے لحاظ سے بڑی زنّاٹے کی اُردُو بولتی ہیں، لیکن ریڈیو ماسکو میں میلاؔ نے ایسی شستہ تر و تازہ اُردُو بولی کہ ہم ہزار جان سے عاشق ہو گئے۔ آپ بے شک میلاؔ پر سمجھ لیں۔ ہماری مُراد اُن کی اُردُو سے ہے۔ لکھنؔو کے لہجے میں بولتی ہیں اور لکھنو ہو بھی گئی ہیں۔ ہماری کلاسیکس سے بہت رغبت ہے۔ غالبؔ پسند ہیں۔ ہم نے اُن کو میرؔ کی راہ پر لانے کی کوشش کی لیکن اِس کے لئے ایک دِن کی ملاقات کافی نہ تھی۔ اُن کے گلے میں ایک طلائی زنجیر تھی جس میں اللہ کا نام لٹکا ہوا تھا۔ ہم نے کہا دیکھو اللہ کیسے تُم کافروں کے سر چڑھ کر بولا ہے۔ بولیں آپ مُجھ کو کافر کہتے ہیں؟ ہم نے کہا جو بھی تمہیں دیکھے گا کافر ہی

کہے گا۔ بشرطیکہ شاعر اور صاحبِ دِل ہو۔ ہم اعتقاد کی باریکیوں میں نہیں جانتے۔ اُردُو فارسی شاعری کے محاورے میں گفتگو کرتے ہیں۔ فیض صاحب کی عاشق ہیں۔ یہ نامراد لفظ ہمارے قلم سے جا و بے جا نکل جاتا ہے۔ اس موقع پر چنداں مضائقہ اِس لئے نہیں کہ کون ہے جو فیض صاحب پر عاشق نہیں ہے۔ ع

تمام شہر ہے دو چار دس کی بات نہیں

(۵)

ہم نے ایروفلوٹ میں سفر کرنے والوں کو ہدایت کی تھی کہ اپنے ساتھ کمبل، تکیہ، ناشتہ دان سگریٹ وغیرہ لے کہ چلا کریں۔ یہ فرض نہ کرلیں کہ جہاز میں ملے گا۔ الماتا سے ماسکو واپسی کے جہاز میں جو کھانا ملا وہ ایک پاپے کے علاوہ دو تین مربّع انچ کے گوشت کے ٹکڑے پر مشتمل تھا۔ آپ ہنٹر بیف کی قبیل کا سمجھ لیں لیکن ہنٹر بیف خستہ ہوتا ہے اور نمکین بھی۔ یہ پھیکا اور سخت تھا۔ ہم نے کھانا دینے والی بی بی سے کہا کامریڈ ذرا نمک تو دو۔ ہمارا مطلب یہ تھا کہ کُچھ گوشت پر چھڑکیں گے باقی اپنے زخموں پر چھڑک لیں گے۔ لیکن اُس نے کہا جناب نمک کا یہاں کیا کام؟ نمک ہمارے پاس نہیں ہے۔ ایسی عیاشی کہیں اور ہوتی ہو گی۔ ہم نے سوچا کہ نیّت کر کے

روزہ رکھ لیں۔ کیونکہ مہینہ رمضان کا جارہا تھا لیکن وہ وقت سہ پہر کا تھا۔ بھوک بھی تھی۔ وہ ٹکڑا گوشت کا بجائے اندر جانے کے باہر کو آتا تھا۔ آخر کانٹے اور اس دوہے کی مدد سے اِسے بمُشکل اندر اُتارا۔

دیکھ پرائی چوپڑی مت ترساویں جی

روکھی سوکھی کھائے کے ٹھنڈا پانی پی

ہمارے بھی ہیں ترجماں کیسے کیسے

ہم اپنے کالم کو تو بھولے ہی تھے، سفر نامے کو بھی بھول گئے۔ الماتا سے ماسکو آکے رُک گئے۔ دیکھنے کی چیز کے ذکر تک پُہنچے ہی نہیں۔ وہ ہے لینن گراڈ کا شہر۔ پہلے سینٹ پیٹرز برگ کہلاتا تھا، پھر پیٹر گراڈ رہا پھر لینن گراڈ ہوا۔ اِس شہر کی خوش قسمتی ہے کہ پھر نام نہیں بدلا۔ اِسٹالن گراڈ اور اِسٹالن آباد اب کُچھ اور گراڈ اور کُچھ اور آباد کہلاتے ہیں۔



الماتا سے واپسی پر ہوٹل وہی روسیا لیکن کمرہ نیا ملا اور ترجمان بھی نیا بلکہ نئی۔ نام کو رائٹرز یونین سے فون آیا کہ مِس نطالیا آپ کے پاس آ رہی ہیں۔ یہ آپ کی ترجمان ہو گی۔ ہم نے اور تو کُچھ نہ کہا۔ بورے روس میں ہوتے ہی نہیں، بس غُسل خانے میں جا کر کنگھا کیا اور مانگ درست کی اور مُنہ دھویا۔ خیر غیر ضروری تفصیلات کی کیا حاجت ہے وہ ورود فرما ہوئیں۔ اشفاق مرزا بھی پاس ہی بیٹھے تھے۔ محض تعارفاً عرض کر دیں کہ عمر اُس بی بی نے از خود اپنی ۲۸ سال کی بتائی۔ کُچھ رعایتی نمبر دیں تو

خوبصورت بھی تھیں۔ چال اچھّی، ڈھال اس سے بھی اچھی۔ آتے ہی فرمایا بندی کا نام یہ ہے۔ آپ فلاں ابن فلاں ہیں؟ ہم نے کہا من آنم کہ من دانم۔ دوسرا سوال یہ کیا کہ آپ کو روسی آتی ہے؟ ہم نے کہا اے بی بی نہیں روسی آتی تو تم یہاں کیوں آتیں۔ ایک وقت میں ایک ہی چیز آسکتی ہے۔ اپنے روسی زبان نہ جاننے کی خوشی بھی ہوئی۔ یورپ میں انگلستان سے باہر بھی ہم کئی جگہ گئے ہیں اور جاپان بھی۔ اِن مُلکوں کی زبانیں جو ہمیں نہیں آئیں تو اِس کو ہماری نالائقی نہ سمجھا جائے۔ تھوڑا غور کرنے سے مصلحت سمجھ میں آجائے گی۔ کبھی کبھی تو افسوس ہوتا ہے کہ اُردُو بھی کیوں آتی ہے۔ ترجمان سے کام چلاتے۔ اب اُنہوں نے کہا۔ یہ روبل آپ کے خرچ کے لئے ہیں۔ ہم نے کہا روبل ہمارے پاس بہت ہیں، یونیسکو کے دیے ہوئے ختم نہیں ہوئے۔ روپے کا ہمیں یُوں بھی لالچ نہیں اِسے دوسروں کے ہاتھ کی میل سمجھتے ہیں۔ دوسرے ہمارے ملک کا کوٹا ایک لینن انعام سے پُورا ہو چکا ہے۔ مزید کی خواہش نہیں۔ آپ آگئیں تو روبل آگئے۔ انہوں نے بہت اصرار کیا، ہم نے بہت انکار کیا۔ نتیجہ قارئین کے قیاس پر چھوڑتے ہیں۔ اب ہم نے کہا۔ مزید تعارف فرمایا۔ فلاں فلاں جگہ پڑھاتی ہوں۔ ہم نے کوئی خدمت کرنے کی پیشکش کی۔ مطلب چائے وغیرہ سے تھا تو ایک دم اُٹھ گئی کہ نہیں۔ اب میں جاؤں گی، صُبح

صبح تیّار رہئے گا۔ ہم صُبح خیز نہیں، تھوڑا ڈر گئے۔ اسلام آباد میں نوکری اِسی لئے نہیں کی کہ وہاں سات بجے دفتر لگتے ہیں، لوگ چھ بجے گھر سے نکلتے ہیں، پانچ بجے دِن بھر کے لیے سبزی گوشت لینے جاتے ہیں، چار بجے اُٹھتے ہیں کیونکہ بیوی تین بجے سے اُٹھانا شروع کر دیتی ہے کہ اُٹھو، دو بجے سے الارم بج رہا ہے۔ دفتر جانے کو دیر ہو جائے گی۔ پس ہم نے کہا۔ ساڑھے آٹھ سے پہلے تو نہ آیئے گا۔ بولیں میں گیارہ بجے آؤں گی۔ ہم نے کہا۔ آپ نے تو صُبح کا کہا تھا، بولیں میں بھی صُبح کے گیارہ بجے کی بات کر رہی ہوں۔ ہم نے اپنی غَلَط فہمی پر معذرت کی اور بتایا کہ ہمارے ملک میں چوبیس گھنٹے میں دو بار گیارہ بجنے کا دستور ہے اور وہاں یہ ترجمان کی صوابدید چھوڑا جاتا ہے کہ جونسے گیارہ بجے بھی چاہے سمجھ لے۔ ہم نے کہا کہ اگر صُبح کی بات ہے تو نو بجے رکھئے تا کہ باہر نکلیں تو کُچھ دیکھ بھی لیں۔ یہ لمبی لِسٹ ہمارے پاس عجائب گھروں، گیلریوں اور باغوں اور سڑکوں کی ہے۔ آخر دس بجے پر سمجھوتہ ہو گیا۔ اشفاق مرزا رُوسی بولنا جانتے ہیں، وہ بیٹھے مُسکراتے رہے۔ قارئین کرام۔ اُوپر کے مکالموں سے ہمارے اخلاق کا اندازہ نہ لگایا جائے وہ تو اِس سے بھی زیادہ خراب ہے۔ زبانیں مختلف ہونے کی وجہ سے چند در چند غَلَط فہمیاں ہو ہی جاتی ہیں۔

اگلے روز نطالیہ بیگم آئیں اور ہمیں ریڈ اسکوئر لے گئیں۔ ہم نے کہا۔ یہ ہم نے دیکھا

رکھا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ لال کنگروں والی اِس فصیل کے پیچھے کریملن ہے جہاں زار وغیرہ رہتے تھے۔ پھر میں آپ کو بتاؤں کہ ۱۹۱۰ء میں انقلاب آ گیا۔ ہم پوچھنا چاہتے تھے کہ کیوں آیا۔ کیسے آیا۔ کون لایا۔ پھر سوچا اِس کو معلوم نہ ہونے دینا چاہیے کہ ہمارا تاریخ کا عِلم کتنا ہے۔ بولیں۔ یہ سامنے وہ جگہ ہے جہاں لوگوں کے سر کاٹتے تھے۔ اُس کا خیال تھا اِس پہ ہم کانپ جائیں گے۔ لیکن اپنے مُلک کی تقریروں میں ہم اتنی بار اتنے لوگوں سے سُن چُکے ہیں کہ یہ مُلک کے لئے سر کٹوانے کو تیّار ہیں کہ زیادہ متاثر نہ ہوئے۔ فرق یہ ضرور ہے کہ وہاں لوگوں کے سر اُن کی رضامندی کا یا رضاکارانہ اعلان کا انتظار کئے بغیر کاٹے جاتے تھے۔ یہ لوگ بغاوت وغیرہ کرتے ہوں گے۔ عوام اور مزدوروں وغیرہ کی بات کرتے ہوں گے۔ کسانوں کو جاگیرداروں کے خلاف اور رعایا کو زار کے خلاف بہکانے اور اُکساتے اور دھمکاتے ہوں گے۔ ہم نے دِل میں سوچا کہ ایسی تخریبی کاروائیاں کرنے والوں کا سر نہ کاٹا جائے تو کیا کاٹا جائے۔ بال کاٹے جائیں؟ ناخن کاٹے جائیں َلیکن مہمان ہونے کی وجہ سے چُپ رہے۔ بظاہر زاروں کی مذمّت کرنے کا اِرادہ تھا۔ لیکن پھر سوچا کہ بے شک زار وغیرہ انقلاب سے پہلے ہوتے تھے اور حسبِ توفیق ظالم بھی ہوں گے لیکن تھے تو روسی۔ ایسا نہ ہو مِس نطالیہ زاروں کی برائی ہم سے سُن کر ناراض ہو جائیں۔ کم

از کم ہمارے ہاں تو ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں کوئی کسی مُغلیہ تاجدار کو کُچھ کہہ کے تو دیکھے۔ ہم ایک بار کہہ کے بھگت چُکے ہیں۔ اب نطالیہ بی بی نے کہا: یہ جو سامنے کوٹھا ہے جس کے سامنے قطار ہے۔ یہ لینن کا مقبرہ ہے۔ ہم نے کہا یہ ہم دیکھ چُکے بلکہ اندر سے بھی دیکھ چُکے۔ انہوں نے کہا۔ اچھّا، میں تو سوچتی تھی آپ کو اِس بار لانگ لمبی قطار کے پیچھے کھڑا کر کے گھر چلی جاؤں گی۔ کُچھ کام ہے۔ ہم نے کہا جی نہیں کُچھ اور دکھانا ہو تو دِکھایئے، کوئی عجائب گھر کوئی گیلری۔ بولیں آج بند ہیں۔ ہم نے کہا۔ دوسرے مُلکوں میں تو اتوار کو یہ التزام سے کھُلا رکھتے ہیں۔ بولیں نہیں یہاں بند ہوتے ہیں۔ ہم نے کہا آیئے۔ غریب کانے پر یعنی ہوٹل کے کیفیٹیریا میں کُچھ روٹی ماسلا وغیرہ کھایئے۔ ملاکو وغیرہ پیجیئے۔ لیکن انہوں نے کہا جی نہیں۔ میں گھر جاتی ہوں۔ اب کل صُبح یہی دس گیارہ بجے۔ ہم نے کہا خیر۔۔۔

شام کو ہمیں افسوس ہوا کہ دِن ہمارے پاس تھوڑے ہیں اور دیکھا ہم نے کُچھ نہیں۔ بے شک نطالیہ بی بی کو دیکھ کر جی تھوڑا خوش ہوتا ہے لیکن اور بھی کام ہیں دُنیا میں محبّت کے سوا۔ پس ہم یونین والوں سے درخواست کریں گے کہ کسی اور کو بھیجیں جو ہمیں شہر دِکھا سکے۔ یہ بات ہم نے سوچی ہی تھی، زبان سے کہی نہیں تھی لیکن جیسا کہ آپ نے اخباروں کتابوں میں پڑھا ہو گا۔ روس میں ہر جگہ خُفیہ

مائیکروفون وغیرہ لگے رہتے ہیں۔ ہماری یہ خواہش کریملن پہنچی ہو گی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اگلے دِن وہ نہ آئیں ایک صاحب آئے۔ بولے نطالیہ کو زکام اور مصروفیت ہو گئی ہے۔ آج مُجھے بھیجا گیا ہے۔ ہم نے کہا اچھّا کسی غزل نظم کا مضمون ہاتھ سے نکل جانے کے باوجود ہم خوش ہوئے۔ پھر انہوں نے کہا، میں ہندی بھی جانتا ہوں۔ دہلی میں تین برس رہا ہوں۔ چنانچہ نمستے۔ ہاتھ جوڑ کر پرنام وغیرہ بھی کیا۔ ہم نے کہا مہاشے ہندی آپ جانتے ہیں تو اچھّی صحبت رہے گی۔ لیکن سلام دُعا میں گُڈ مارننگ ہی کافی ہے۔

ایک لمبے آدمی کے ساتھ

سرجی نوجوان ہے، قد میں لمبا آدمی ہے۔اِس سے جو نتیجہ آپ چاہیں اخذ کریں اور اگر کوئی پڑھنے والا خود لمبا ہے تو اپنے کو استثنا شمار کرنے میں کوئی امر مانع نہیں۔ ہم نے کہا اچھّا تو میاں سرجی۔ چلو شہر دیکھیں۔ کل تو خیر اتوار تھا۔ ضائع ہوا۔ آج عجائب گھر اور گیلریاں دیکھ لیں۔پہلے یہ دیکھیں، پھر وہ، پھر وہ۔ بولے۔ جناب آج پیر کے دِن سب بند ہوتی ہیں۔ یہ چیزیں تو اتوار کو کھُلتی ہیں تا کہ سیّاح وغیرہ بخوبی دیکھ لیں۔ کل آپ کیا کرتے رہے۔ ہم نے بتایا کہ کیا کرتے رہے۔ بلکہ نہ کرتے

رہے۔ نطالیہ کو رُخصت کر کے لمبی تان کے سو گئے تھے۔ شام کو حسین شاہ راشدی کے ساتھ چائے کی کیتلی بھر کر بیٹھ گئے تھے۔ بولے اُسے معلوم نہ ہو گا۔ ہم نے کہا کوئی شہر کی گائیڈ بُک دو، نقشہ دو، عجائب گھروں کے اوقات کی فہرست دو۔ بولے یہ کُچھ تو میرے پاس نہیں ہے۔ ہم نے کہا اچھّا ہمیں اسٹیٹ لائبریری لے چلو۔ سُنا ہے قریب ہی ہے۔ ہم نے اُس کے متعلّق پڑھ رکھا تھا کہ دُنیا کی سب سے بڑی لائبریری ہے۔ اُس میں دو کروڑ ڈھائی کروڑ مطبوعات ہیں، رسالے ہیں، ریکارڈ ہیں، نقشے ہیں۔ اُس کی الماریوں کو ساتھ ساتھ مِلا کر رکھا جائے تو چار سو کلو میٹر لمبی ہو گی۔ کوئی سولہ ہزار غیر مُلکی رسالے اور چھ سو غیر مُلکی اخبار آتے ہیں۔ ہمیں تو یہ دیکھنی ہی تھی۔ خاص طور پر یہ کہ پاکستان کے بارے میں کیا ہے۔ اُردُو کی کتابیں کتنی ہیں۔ ہم بڑے مشہور اور کثیر التصانیف اور مایہ ناز قسم کے مصنّف ہیں، اپنی تصانیف دیکھ کر آنکھیں روشن کرنا چاہتے تھے۔ پس سرجی سے کہا۔ اٹھو اب کوچ کرو، لائبریری دیکھیں۔

سرجی نے کہا ٹھہرو۔ شاید یونین کی کار مل جائے۔ بہت سی روسی بولنے کے باوجود وہ انہیں نہ ملی۔ ہم نے کہا سُنا ہے دور نہیں۔ بولے ٹیکسی لیتے ہیں۔ کئی ایک کے پاس گئے سبھی نے یہ سُن کر کہ اتنا قریب جانا ہے۔ مُنڈیا ہلا دی۔ ہمیں خُوشی ہوئی کہ

ہمارے دونوں ملکوں میں لاکھ اختلاف ہوں کم از کم دونوں مُلکوں کے ٹیکسی ڈرائیوروں میں باہم اختلاف نہیں ہے۔ اِس کا مزید ثبوت ایک روز اور ملا۔ ہم بہت دیر ٹیکسی کے لئے کھڑے رہے۔ اُس دِن ایک دوسری لائبریری جانا تھا جو تھی تو چند فرلانگ پر لیکن ہم کو جلدی تھی۔ لائبریری کا نام روسی زبان میں لکھوار کھا تھا۔ جس کو دِکھاتے مُنہ پھیر کر چلا جاتا۔ آخر ایک شخص جو بہت دیر سے کھڑا ہمیں دیکھ رہا تھا اپنی لمبی سی کار لایا۔ ہم نے دِل میں کہا۔ شریف آدمیوں کی ہر قوم میں کمی نہیں ہوتی۔ پس بیٹھ گئے۔ بیٹھنے کے بعد دیکھا کہ اُس میں میٹر ہی نہیں ہے۔ اُس سے ایک دِن پہلے ہم وہاں جا چُکے تھے ۲۸ کوپک بنے تھے۔ ہم نے سوچا ہم پیسے کی پروا نہیں کرتے اور کرنی بھی نہیں چاہیے۔ طے کیا کہ ۲۹ دے دیں گئے۔ ۳۰ دے دیں گے۔ یہ تو خیر ہماری آپ کی آپس کی بات ہے ہمارے پاس ۵ کوپک کی ریز گاری تھی۔ ہم نے سوچا سارے دے دیں گے۔ بے شک چین میں کہیں بخشش کا رواج نہیں، ہمارا خیال تھا روس میں بھی نہ ہو گا۔ لیکن وہاں لوگوں نے حتّٰی کہ ہمارے ترجمان نے بھی بتا دیا کہ ہمارے ہاں کے لوگ بخشش لینے کے معاملے میں سنگ دِل نہیں ہیں۔ جتنی زیادہ کوئی دے، قبول کر لیتے ہیں۔ زیادہ ہو تو سپاسی بو بھی کہہ دیتے ہیں۔ مُمکن ہے چین سے روس کے جو شدید اختلافات ہیں اُن میں بخشش لینے نہ لینے

کا مسئلہ بھی ہو۔ بہر حال منزل پہ پہنچ کر ہم نے سارے سکّے ۵۵ فرانک ڈرائیور کے ہاتھ میں دیئے اور سیر چشمی سے کہا۔ رکھ لو۔ لیکن اُس نے مُٹھّی کھُلی رکھی۔ ہم نے جانا وہ صرف اپنا کرایہ لینا چاہتا ہے بخششیں وغیرہ نہیں۔ لیکن وہ اُنگلی کھڑی کر کے بولا۔ پورا ایک روبل ہو گا۔ ہم نے کہا بھلے آدمی۔ اتنا سا فاصلہ۔ وہ سامنے ہمارا ہوٹل نظر آرہا ہے۔ ۵۵ کوپک کو کافی جانو۔ لیکن وہ بہت جُز بُز ہوا۔ اتنی شرافت کی کہ ہمیں زدوکوب نہ کیا۔ ایک پاکستانی بزرگ نے اپنا واقعہ بھی بتایا کہ کیسے ایک میل کے فاصلے کو دور دور کی سڑکوں پر گھُما کر ڈرائیور نے آٹھ میل بنا دیے۔ ہمارے مُلک میں ذرا نکتہ چینی اور میں میکھ نکالنے کی عادت زیادہ ہے۔ لوگ اِس قسم کی باتوں کو بُرا مان جاتے ہیں۔ اخباروں میں شکایتی خطوط وغیرہ لکھ دیتے ہیں۔ ایسی زود رنجی مناسب نہیں۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا، اِس قسم کی باتوں سے اسلام یا مارکسزم کا کیا نقصان ہو جاتا ہے۔

خیر قصّہ سرجی میاں کا تھا۔ اُس دِن کوئی سواری نہ ملی تو انہوں نے کہا سب وے یعنی انڈر گراؤنڈ ٹرین لیتے ہیں۔ ہم نے کہا۔ اچھا خیال ہے۔ وہ سب سے تیز جاتی ہے۔ اِس سے پہلے ہم وہاں کی انڈر گراؤنڈ کے خوبصورت مرمریں اسٹیشن بھی دیکھ چکے تھے۔ بولے تو پھر چلو چنانچہ اُس سِمت میں پہلے یہ سڑک، وہ سڑک، یہ گلی وہ گلی۔ یہ

موڑ، وہ موڑ، ہم نے کہا۔ کہاں جا رہے ہو۔ بولے انڈر گراؤنڈ اسٹیشن۔ ہم نے کہا کہاں ہے۔ بولے یہیں کہیں تھا۔ ہم نے کہا کسی سے پُوچھ لو۔ ہمارے بہت اصرار پر انہوں نے کسی سے پوچھا۔ اس نے ہمیں اُنہیں راستوں اور انہی سڑکوں سے آدھا میل واپس جانے اور داہنے ہاتھ مُڑ کر پھر بائیں ہاتھے مُڑنے کا مشورہ دیا۔ بالآخر اسٹیشن آیا۔ ٹکٹ لے بیٹھے۔ تین اسٹیشن بعد اُترے۔ بولے۔ اب یہاں سے گاڑی بدلی جائے گی۔ اِس دوسری لائن کا پلیٹ فارم سُرنگ در سُرنگ آدھ میل دور ہو گا۔ اب اُس میں بیٹھے اور دو اسٹیشن بعد اُترے۔ پھر باہر نکلے۔ اب سرجی میاں نے مشرق کی طرف دیکھا، پھر مغرب کی طرف دیکھا۔ یہ دونوں سمتیں پسند نہ آئیں تو جنوب کو دس قدم چلے۔ پھر بولے نہیں اُدھر ہے۔ چنانچہ شمال کو واپس ہوئے۔ آدھ میل چل کر ہمارے اصرار کرنے پر کسی سے پوچھا۔ اُس نے دو چار گلیوں کے بعد پارک کے پرلی طرف کا سُراغ دیا اور بالآخر ہم پہنچ ہی گئے۔ واپسی پر ہم نے کہا بھئی اب جب بھی ملے ٹیکسی ہی لیں گے کیونکہ ہم یہاں کام سے آئے ہیں۔ ہچ ہائکنگ کے لئے نہیں آئے۔ ٹیکسی مل گئی۔ اُس نے زن سے ہمیں کوئی تین منٹ میں اور کوئی بیس کوپک میں ہوٹل کے آگے لا کھڑا کیا۔ ہمارا یہ سفر کُچھ ایسا ہی تھا جیسے کوئی عید گاہ سے صدر جانے کے لیے پہلے لِی مارکیٹ جائے، وہاں سے نئی

کراچی، پھر کورنگی اور محمود آباد وغیرہ سے ہوتا ہوا صدر میں آکر نکلے۔ راولپنڈی کے پڑھنے والے اِسے صدر سے کچہری اور جیل جانے کے لئے (یہ دونوں مقام محض مثالاً لکھے ہیں) یہ راستہ سمجھیں۔ صدر سے راجہ بازار سے فیض آباد، وہاں منصور قیصر کے گھر سے مُڑ کر چوہڑ چوک، ہارلے اسٹریٹ اور پھر گوال منڈی میں سے نکلتے ہوئے کچہری یا جیل۔ اِن میں سے جو جگہ بھی پسند ہو۔ یا جس کے بھی مستحق ہوں۔ ہم نے کہا میاں سرجی یہ تُم نے کیا کیا۔ رات ہمیں حسین شاہ نے قریب ترین انڈر گراؤنڈ اسٹیشن دِکھایا تھا۔ وہ تو ہمارے ہوٹل سے آدھا فرلانگ بھی نہ تھا۔ بولے۔ اچھّا؟ مُجھے معلوم نہیں۔ دراصل میں اِدھر کبھی آیا نہیں۔ یہ بھی وضاحت کی کہ میں ترجمان ہوں، گائیڈ نہیں۔ ہم نے آنکھوں ہی آنکھوں میں پھر اُن کا قد ناپا اور چُپ ہو رہے۔ یہ ماجرا اپنی جگہ سچ ہے۔ لیکن سرجی بعد میں بہت مُخلص اور معصوم آدمی ثابت ہوا۔ مُخلص اور معصوم آدمی کبھی اچھّے گائیڈ یا ترجمان نہیں ہوتے۔ وہ اتّفاق سے ہمارے ایک پاکستانی دوست کے ساتھ بھی رہ چُکے تھے بولے۔ کیا شاندار آدمی ہے۔ ہم نے کہا۔ ہمارے مُلک میں اِس کا بڑا نام ہے۔ بولے وہ تو ہو گا۔ شیمپین ڈٹ کے پیتا ہے۔ تُم تو کچھ بھی نہیں پیتے۔ ہم نے پھر اپنے دوست کے ادبی اور علمی کمالات کا تذکرہ کیا۔ لیکن سرجی نے جب بھی اُن کا ذکر کیا

اور اگلے چار روز میں کئی بار کیا۔ اِسی عنوان سے کہا کہ شاندار آدمی ہے۔ کیا غٹا غٹ شیمپین پیتا ہے۔ اتّفاق سے ایک اور جاپانی نامور ادیب کے ساتھ بھی اُن کو ترجمانی کا شرف حاصل ہوا تھا۔ ہم نے اُن کی بہت تعریف کی۔ ناک مُنہ چڑھا کر بولے۔ ادیب ہو گا لیکن وہ تو کُچھ بھی نہیں پیتا تھا۔ جانے ایسے لوگ یہاں کیا کرنے آتے ہیں۔ اپنی عزّت رکھنے کے لیے ہم نے کہا کہ ہم بھی بہت پیتے ہیں۔ بالخصوص شیمپین تو ہمیں بہت ہی پسند ہے۔ وہسکی بھی ایک آدھ بوتل ناشتے، کھانے کے ساتھ لے لیتے ہیں لیکن آج کل ہمیں کُچھ زکام ہے۔ قبض بھی ہے۔ اُس لیے پرہیز کر رہے ہیں۔ انہوں نے ہمیں بے اعتباری سے دیکھا ضرور۔ جھوٹا سمجھا ہو گا۔

ہمارے عالی صاحب خوش قسمت آدمی ہیں۔ دُنیا مِرے آگے، میں اُن کے ساتھ جو ترجمان تھا وہ اُردُو کے علاوہ ماسکو اور لینن گراڈ کی گلیوں سڑکوں کو بھی جانتا تھا۔ اور شیمپین سے زیادہ اُن کی شاعری کا مدّاح تھا۔ حسین شاہ راشدی بھی خُوش قسمت تھے۔ اُن کی ترجمان بھی بہت اچھّی لڑکی تھی۔ صورت بھی اچھّی پائی تھی۔ عُمر میں بھی نطالیا سے چار برس چھوٹی۔ حتیٰ کہ حسین شاہ نے ہماری نطالیہ کے لیے فرمایا۔ آج وہ تمہاری بُڑھیا کیوں نہیں آئی۔ حُسین شاہ کی ترجمان مس میلا جو فرینڈ شپ ہاؤس نے مہیّا کر رکھی تھی، اُن کے سارے کام اسپتال سے لے کر دفتروں کے چکّر

تک خوش اسلوبی سے بھگتاتی تھیں اور ڈیوٹی کے اوقات کی بھی پرواہ نہ کرتی تھیں۔ حسین شاہ سے اُن کی سنگت اور بیٹھک بھی ہر روز ہوتی تھی۔ حتّیٰ کہ ہمیں کُچھ رشک بھی ہونے لگا (یہی لفظ زیادہ قرین مصلحت ہے) اور ہم نے اپنی دعا تیز کر دی کہ اُن کے چچا اور ہمارے پیر حسّام الدّین راشدی جلد صحت یاب ہو کر وطن واپس جائیں تا کہ اِس نوجوان کا جسے ہم پسند کرنے لگے تھے، اخلاق خراب ہونے کا شائبہ پیدا نہ ہو۔ دو دِن بعد یہ جان کر مایوسی ہوئی کہ وہ تو اپنے منگیتر کے بارے میں اُن سے مشورہ کیا کرتی تھیں۔ اِس لڑکے کو اکثر اپنے ساتھ لاتی تھیں۔ ایک روز ہمارے سامنے بھی وہ لڑکا آیا۔ واقعی اُونچا تھا اور پیر حسین شاہ جلد از جلد میلا کو اپنے ہاتھ پیلے کرنے کی تلقین کر رہے تھے۔ پھر ہم نے دیکھا کہ حسین شاہ راشدی پیتے بھی نہیں۔ صرف سوڈے کے قدحے اور چائے کے سماور اپر ہماری اُن کی شام سے رات ہو جاتی تھی۔ بعد میں انہوں نے کہا میں سمجھا تھا کہ آپ مُجھ سے چھُپ کر پیتے ہیں کیونکہ میرے چچا کے دوست ہیں۔ ہم نے کہا میاں ہمارا بھی یہی خیال تھا کہ ہم سے چھُپا کر چُسکی لگاتے ہو کیونکہ ہمارے دوست کے بھتیجے ہو۔ سر جی ہوتے تو اِن کے بارے میں بھی یہی کہتے کہ شیمپین نہیں پیتا تو پھر یہ شخص یہاں کیا کرنے آیا ہے۔

خیریت موجود۔خیریت مطلوب

اچھاتو قارئین کرام! خیریت موجود خیریت مطلوب۔ پھر ہم میں اور ٹوکیو ہے اور باہر بلا کی سردی ہے۔ رات کا ایک بجا ہے اور سارا سنسار سویا ہوا ہے۔ پاکستان میں البتہ ابھی نو بجے رات کا عمل ہے۔ ابھی ابھی آپ نے اپنا محبوب ڈراما اور محبوب اشتہارات دیکھ کر جن میں اتّفاق سے آپ کے محبوب چہرے بھی آتے ہیں، ٹیلیویژن سے مُنہ پھیرا ہو گا کیونکہ خبر نامہ شروع ہونے والا ہے اور خبروں میں کیا دھرا ہے۔ مُلک نے تھوڑی سی اور ترقّی کر لی ہو گی۔ لبنان میں تھوڑی سی اور جنگ

ہو گئی ہو گی۔ روڈیشیا وغیرہ افریقہ کے کالوں گوروں کے داخلی مسائل میں ”بیوی کھانا رکھو“ اجی رکھتی ہوں۔ جا بے لڑکے چوک سے پکّی پکائی روٹی لے آ، میں ذرا دوپٹّہ سے آنسو پونچھ لوں۔ سچ بڑا پُر درد ڈراما تھا۔ عورت کتنی معصوم ہوتی ہے۔ یہی دیکھو بیٹھے بیٹھے حکم چلا دیا۔ بیوی کھانا رکھو، بیوی بیچاری سال خواتین اور ہفتہ خواتین کے بعد بھی غُلام ہی رہی۔

آپ کہیں گے کہاں لینن گراڈ، کہاں مہاشے سرجی اور کہاں نطالیا اور کہاں ٹوکیو، عرض یہ ہے کہ لینن گراڈ بھاگا تھوڑی جاتا ہے۔ پھر سچّی بات یہ ہے کہ لینن گراڈ پر جمیل الدّین عالی اپنے مشور سفر نامے، دُنیا مِرے آگے، میں جس بے مثال انداز سے لکھ گئے ہیں، اِس کے بعد ہم لکھنے سے بہانے بہانے کترا رہے ہیں۔ کوئی پُرانا سفر نامہ ہوتا تو ہم اُس میں سے کُچھ چُرا لیتے اور آپ کو کانوں کان خبر نہ ہوتی۔ یہ تو ابھی کل کی بات ہے۔ ٹوکیو کے لیے ہمارا ٹکٹ تو SAS والوں کے پاس آیا تھا۔ ہم نے اُسے واپس بھجوا دیا کہ ہماری پیاری قومی ائیر لائن پی آئی اے پر بھیجو، ہماری حُبّ الوطنی میں کلام نہیں اور ہم یہ چاہتے تھے کہ یہ گیارہ بارہ ہزار روپے کا زرِ مبادلہ ہمارے مُلک کو ملے۔ اس کی وجہ یہ نہ سمجھی جائے کہ پی آئی اے کا جہاز بڑا تھا اور ایس اے ایس کا چھوٹا تھا۔ پی آئی اے کا اچھّے وقت چل کر دوپہر کو اچھّے وقت

ٹوکیو پہنچتا ہے۔ کسی دوسرے جہاز میں ہمیں رات کو نجل خراب ہونا پڑتا۔ پھر پی آئی اے والے خیال بھی بہت کرتے ہیں۔ آرام بھی بہت ملتا ہے۔ کھانا بھی حلال ملتا ہے۔ گویا حرام چیزوں میں سے کم از کم ایک چیز یعنی جھٹکے وغیرہ سے تو بچ سکتے ہیں۔ باقی رشوت، سود اور شراب وغیرہ رہ گئے۔ اِن کے بارے میں اختلاف بھی پایا جاتا ہے۔ رشوت تو ایک طرح سے تھوڑی تنخواہ والے افسروں کی مالی مدد ہوتی ہے اور سود کو کمپنیاں منافع لکھتی ہیں اور شراب کے متعلّق پینے والے فقہا کا بیان ہے کہ کہیں حرام قرار نہیں دی گئی۔ بس ایک آدھ جگہ تذکرۃً بُرائی کی گئی ہے۔ وہ بھی اِس طور کہ ایک وقت میں ایک آدھ بوتل سے زیادہ مستحسن نہیں۔ اور دِن میں دو تین بار سے زیادہ نہ ہو۔ اور اِس کے بعد بُرائیوں سے اِجتناب کرو۔ صرف سؤر اور مشین کے کٹے ہوئے گوشت کے حرام اور مکروہ ہونے کے بارے میں صحیح العقیدہ مسلمانوں میں اختلاف نہیں۔ کم از کم ہمارے مُلک میں نہیں۔ پی آئی اے میں ایک کمی کا احساس البتّہ ہوا۔ وہ یہ کہ یہ لوگ راستے میں پاجامے اور سلیپنگ سوٹ وغیرہ فراہم نہیں کرتے۔ ہم اپنی پتلون ہی میں سوئے۔ شکنیں پڑ گئیں، منیلا تک مسافروں کا ٹریفک کم ہونے کی وجہ سے رات کو ایک ایک مسافر کے حصّے میں سات سات نشستیں آئیں۔ ہم نے بہت پاؤں پھیلاتے حتّٰی کہ چادر دیکھ کر پاؤں پھیلانے

کے محاورے کی خلاف ورزی بھی کی۔ تاہم چار سیٹوں سے زیادہ نہ گھیر سکے۔ ہمارا اِرادہ تھا کہ باقی اپنے حصّے کی تین نشستوں کے عدم استعمال کے لئے پی آئی اے سے ہرجانے یا معاوضے کا مطالبہ کریں کیونکہ ہم چاہتے تو راستے میں اِسے کسی کو سب لٹ Sublet کر سکتے تھے لیکن ہمارے ہم سفر ڈاکٹر شوکت صدیقی نے، جنھوں نے "خُدا کی بستی" نہیں لکھی اور اسلام آباد میں وزارتِ تعلیم میں ہیں، ہمیں ڈرا دیا کہ تُم نے جو فالتو تین سیٹیں سنبھال رکھی ہیں کہیں پی آئی اے والے اِن کا کرایہ بھی نہ مانگ لیں۔ ہم کسی سے ڈرتے نہیں۔ تاہم ٹانگیں ذرا سکیڑ کر تین سیٹوں تک محدود کر لیں۔ پی آئی اے کے کمبل بھی بہت خوبصورت اور نرم تھے۔ صُبح کو کمبل تو ہمیں چھوڑ رہا تھا، ہم کمبل کو نہیں چھوڑ رہے تھے۔ آخر اپنے مُلک کی چیز تھی۔ اِسے بطور تحفہ اپنے تھیلے میں رکھ لیتے لیکن اِن لوگوں نے حاشیے میں جا بجا پی آئی اے چھاپ رکھا ہے۔ بھلا اِس کی کیا ضرورت تھی، ہماری دیانت پر اعتماد نہیں کیا؟

منیلا سے یک لخت مسافروں کا رش آن پڑا۔ بہت سے تھے۔ حتّٰی کہ لوگوں کے ریلے نے ہمیں فسٹ کلاس والے حصّے میں دھکیل دیا۔ ہم وہیں صبر شُکر کر کے بیٹھ گئے کیونکہ خواہ مخواہ شکایت کرنے کی ہماری عادت نہیں اور وہاں سیٹیں بھی ذرا آرام دہ تھیں اور ناشتہ بھی کُچھ چنگا چوسا تھا۔ عملے والوں نے سبھی کا خیال کیا۔ ہمیں پہچان کر

ہمارا کُچھ زیادہ کر دیا۔ دو کی بجائے تین انڈے کا آملیٹ بنا دیا۔ فواکہات سے بھی تواضع کی۔ ویسے یہ کُچھ اچھّی بات نہیں ہوئی۔ گھر واپس آکر ہمارا موڈ کئی دِن خراب رہے گا کہ ہم کو ایسا ناشتہ کیوں نہیں دیا جاتا۔ پھلوں کا رس کہاں ہے۔ اناس کی قاشیں کیوں نہیں رکھیں۔ کارن فلیک کا ڈبّہ کیوں پرے کھِسکا دیا۔ یہ کیا کہ ایک انڈا اور دو توس سامنے رکھ دیئے۔ مکھّن کے خالص ہونے نہ ہونے پر ہم اتنا زور نہیں دیتے لیکن اِتنا تھوڑا کہ کھانا تو در کنار کسی کے لگاؤ بھی تو خوش نہ ہو؟ اب کے بھی ہمارے بازو پہ دو امام ضامن بندھے تھے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ اِن کی وجہ سے ہم عافیت اور خیریت سے منزل پر پہنچ جاتے ہیں، باقی غیر مُسلم مُسافروں کو جو امام ضامن نہیں باندھے اور مرحوم صدر ایّوب کو جو بندھوانے تھے، مستثنیات میں سے سمجھا جائے۔

پی آئی اے والے بین الاقوامی پروازوں پر فلم بھی دِکھاتے ہیں۔ یہاں بھی منیلا کے بعد فلم شروع ہو گئی، Rooster Cogburn اِس کا نام تھا اور جان وَین اور کیتھرین ہیپ برن نے اِس میں کام کیا ہے۔ یہ ٹھاہ ٹھاہ فلم تھی جسے فلم انڈسٹری والے فخر اور احترام سے ایکشن فلمیں کہتے ہیں۔ سچ یہ ہے کہ ہمیں تو یہ بدر مُنیر اور مسرّت شاہین کی فلموں کی ایک بھونڈی سی نقل نظر آئی۔ اِس میں بھی جبڑے

ٹوٹتے ہیں، بندوقیں دنادن چلتی ہیں۔ خُون خرابہ ہوتا ہے۔ اپنی فلموں کے مُقابلے میں سچّی اور بے لوث محبّت کے مظاہر کی البتّہ ہمیں کمی نظر آئی۔ ہمارے ہاں بعض نک چڑھے لوگ دلہن ایک رات کی اور خان زادہ وغیرہ فلموں کو جن میں بے پناہ ایکٹنگ بلکہ اوور ایکٹنگ ہوتی ہے، گھٹیا اور فُحش کہہ کر رد کر دیتے ہیں۔ کوئی پوچھے کہ بھئی گھٹیا اور فُحش ہونے میں خرابی کیا ہے اور محبّت تو فُحش کسی نہ کسی مرحلے پر ہوتی ہی ہے۔ اگر نئی نسل کا اخلاق خراب ہونے کا سوال ہے تو وہ تو پہلے سے خراب ہے اور اخلاق کا خراب ہونا بھی فی زمانہ کون سی خرابی ہے۔ اپنے وقت پر یعنی داڑھی سفید ہونے تک سبھی کا ٹھیک ہو جاتا ہے بلکہ اکثر تو نماز روزے تک کے پابند ہو جاتے ہیں۔ ایک فلم ۷۰۰ قسم کی پاکستان اور ایران نے مل کر بنائی تھی اور بڑی سعی و کوشش سے اُس میں دونوں مُلکوں کی فلموں کی خرابیوں کو یک جا کر کے یک جہتی کی راہ دِکھائی تھی۔ اِس میں کہانی بھی کوئی خاص نہیں ڈالی تھی۔ بس ہیرو ایک بھاگتی کار کے انجن پر کھڑا ہو کر نغمے گاتا ہے۔ لیکن لوگوں نے اِسے بھی پسند نہ کیا۔ اِس امریکی فلم میں ہم باوجود غور سے دیکھنے کے کیتھرین ہیپ برن کے جسم کا کوئی قابلِ ذکر حصّہ نہ دیکھ سکے۔ ظالم لمبا کوٹ پہنے اور سر پر رومال باندھے رہیں۔ خالی خوبصورتی اور دیدہ زیبی اور دِلفریبی سے کیا ہوتا ہے۔ جسم کی ساخت اور مختلف

طول و عرض بھی تو معلوم ہونے چاہیے تھے کیونکہ ہم ریاضی اور جیومیٹری کے اچھّے طالب عِلم رہے ہیں۔ بہر حال پردیس میں مسرّت شاہین وغیرہ ہمیں بہت یاد آئیں اور اپنی فلم انڈسٹری کی قدر ہوئی۔ اِس امریکی فلم میں جان وَین ایک آنکھ پر پٹّی باندھے بہادری سے کے جوہر دِکھاتا ہے۔ کئی کئی گھڑسواروں کو ڈھیر کر دیتا ہے تاکہ کیتھرائن ہپ برن پر سوائے اِس کے کوئی بُری نظر نہ ڈال سکے اور اِس کی آبرو کی مناسب حفاظت ہوتی رہے۔ لیکن ہمارے ہاں کے ہیروز دونوں آنکھوں پر پٹّی باندھ کر اِس سے زیادہ اچھا نشانہ لگا لیتے ہیں۔ بلکہ سُنا ہے ایک فلم اندھا قاتل میں تو ہمارے شیر بدر مُنیر نے اندھا بن کر اتنا خُون خرابہ کیا ہے کہ دونوں آنکھیں کھول کر بھی کبھی نہ کیا ہو گا۔ ہم نے تو یہاں تک سُنا ہے کہ فلم ساز نے بھی یہ فلم اپنی دونوں آنکھوں پر پٹّی باندھ کر بنائی ہے اور کہانی بھی آنکھیں بند کر کے لکھی گئی ہے، اور دراصل یہ فلم ہے ہی اندھوں کے لیے، جن کے لیے لوگ بالعموم فِلمیں بنانے سے کتراتے ہیں۔ ہم تو ذاتی طور پر اِسے بڑی خدمت سمجھتے ہیں۔

جان وین کی یہ فلم اندھوں کے لئے تو نہیں البتہ بہروں کے لئے تھی۔ مکالمے سُننے کے لئے ڈھائی ڈالر دے کر سُننے کی ٹونٹی لینی پڑتی ہے۔ ڈھائی ڈالر ہم جیسے کھاتے پیتے آدمی کے لیے کوئی بات نہیں لیکن سُن بھی لیتے تو مکالمے کون سے ہماری سمجھ

میں آ جاتے۔ آخری ایک سین میں امریکی جھنڈا بھی دیکھا۔ گویا کوئی حُبّ الوطنی وغیرہ کا بھی قصّہ تھا۔ ہم اِس چیز کو اپنے مُلک تک محدود سمجھے ہوئے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم ہمیشہ سے سائلنٹ یعنی خاموش فلموں کے حامی رہے ہیں اور ناطق فلموں سے خوش نہیں ہوتے۔ کیونکہ کہانی تو ہر جگہ ایک ہی ہوتی ہے۔ حق کی فتح، بد معاشوں کی دُرگت، بے لوث محبّت اور ایثار۔ ہیرو کا بے گناہ قید ہونا۔ شیو بڑھانا اور بعد میں جج کو صداقت آمین مکالموں سے مرعوب کر کے باعزّت بری ہونا۔ دولت کی برائی اور غُربت کی تعریف جیسی کرنی ویسی بھرنی وغیرہ۔ البتّہ آدمی بے سُرے نغموں کی سمع فراشی سے اور مکالموں کی رذالت سے بچتا ہے۔ ہم میں جو اخلاقی خرابی آپ کو کوئی نظر نہیں آتی یہ مخرب اخلاق ناطق فلموں سے اجتناب کا فیضان ہے۔ اِس امریکی فلم میں آخری سین میں جان وَین گھوڑے پر چڑھا فتح مندی میں شراب کا ادّھا غٹا غٹ چڑھاتا نظر آتا ہے۔ ایک بُنیادی فرق ہمارے ہاں کی اور امریکی فلموں میں یہ بھی سمجھنا چاہیے کہ ہمارے ہاں شراب نہ صرف فلم کے دوران میں پی جاتی ہے اور ادّھا نہیں ہمیشہ پوری بوتل ہوتی ہے، بلکہ فلم سے باہر ڈائریکٹر اور فلم ساز کے گھر پر بھی۔ اسٹوڈیو میں سیٹ پر بھی، ہیروئن کے غریب خانے پر بھی۔ دیگر ضروری لوازم کے ساتھ، جِن کی تفصیل میں ہم گئے تو آپ ہمیں ٹوک دیں گے

کہ ہمیں پتہ ہے۔

ذکر ملیریا اور پارسائی کے فقدان کا

جاپان بہت امیر اور ترقّی یافتہ مُلک ہے لیکن اِس میں بعض کمیاں بھی پائی جاتی ہیں۔ اس میں تعجّب کی کوئی بات نہیں۔ داغ تو چاند میں بھی ہوتا ہے۔ آج صُبح یہاں یونیسکو کے ایک جلسے کی صدارت کرتے ہوئے ہم کُچھ زیادہ بول گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بعد دوپہر کے خاصی ماندگی ہوگئی۔ ہم نے اپنی کُرسی پر ایران کے آدمی کو بِٹھایا اور ہوٹل چلے آئے۔ چند دِن پہلے ہمیں ملیریا ہوا تھا۔ ڈاکٹروں نے ایک فقیری نُسخہ ایلوپیتھی کا تجویز کیا جس سے ملیریا تو رفع ہوگیا، اُس کی جگہ کمزوری آگئی۔ اِس سے

ہمیں تکلیف ہوئی تو ہم نے ڈاکٹروں سے کہا کہ بھئی کمزوری لے لو، ملیریا واپس دے دو۔ انہوں نے انکار کر دیا بلکہ کہا بھاگ جاؤ۔ آخر ہم نے اپنے پُرانے دوست اور معالج ڈاکٹر منیر الحق سے دو تین انجکشن طاقت کے لگوائے۔ اِس سے طاقت بحال ہو گئی بلکہ ہم مرد سے جواں مرد ہو گئے۔ ایک حکیم صاحب نے شربت فولاد پینے کا مشورہ بھی دیا تھا۔ لیکن فولاد آج کل اچھّا نہیں ملتا۔ آپ لوگوں کے دیکھتے دیکھتے کراچی میں دو تین عمارتیں ِگر چکی ہیں۔ کیونکہ سریا کمزور ڈالا گیا تھا۔ شربتِ فولاد میں بھی ضرور ایسا ہی سریا ڈالتے ہوں گے۔ بازار میں مختلف کمپنیوں کے کیپسول مل جاتے ہیں۔ باہر سے نیلے پیلے نہایت خوبصورت۔ اندر کی حکایت یہ ہے کہ جس اسکول ماسٹر سے ملیے یہی شکایت کرتا ہے کہ جناب آج کل چاک نہیں ملتے۔ طالبِ علموں کی ریاضی کمزور ہو رہی ہے۔ جس اسٹیشنری والے سے کہو، کہتا ہے کہ جی سارا مال فلاں دواساز لے گیا جس کی فلاں گولیاں اور فلاں کیپسول مشہور اور تیر بہدف ہیں۔ اچھّی اور مؤثر دوائیں نایاب اور کمیاب ہونے کی وجہ سے بعض ایماندار ڈاکٹر تو مریضوں کا علاج دواؤں کی بجائے دُعاؤں سے کرنے لگے ہیں اور دوا خانوں کی بجائے دُعا خانے کھول لیے ہیں۔ مریض آیا۔ انہوں نے تھرمامیٹر اُس کے مُنہ میں دیا۔ سٹیتھوسکوپ لگایا، بلڈ پریشر دیکھا۔ مُنہ کھلوا کر آ آ کرائی اور مریض سے کہا

بھئی تجھے فلاں مرض ہے۔ ذرا قریب آؤ وظیفہ پڑھ کر پھونک دوں کیونکہ دوائیں آج کل نہیں مل رہیں۔ کوئی بد عقیدہ دوا ہی کا قائل ہو تو ڈاکٹر نسخہ لکھ دیتا ہے کہ ہر چار گھنٹے بعد پانی میں گھول کر پی لینا۔ مریض نے پوچھا۔ ڈاکٹر صاحب پرہیز کیا کروں؟ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا۔ بیماری سے پرہیز کرو تا آنکہ تندرست نہ ہو جاؤ یا بازار میں سچ مچ کی دوائیں نہ آجائیں۔

خیر ہمیں جو کمزوری ہوئی تو شبہ ہوا کہ آج کے بلیغ خطبۂ صدارت کے علاوہ اِس کا موجب شاید ملیریا بھی ہو۔ ملیریا کے بارے میں بھی کہا جاسکتا ہے کہ ع

یہ گیا وقت نہیں ہے کہ پھر آ بھی نہ سکے

ہم نے اپنے دوست امان اللہ سردار کو فون کیا کہ اے صاحب! شام کو آؤ تو ملیریا کی دوا کلوروکوئین کی چند ٹکیاں لیتے آؤ۔ کہنے لگے۔ بھئی ٹوکیو میں ملیریا کی کوئی دوا نہیں ملتی۔ ہم نے حیران ہو کر کہا کہ گھڑیاں ملتی ہیں۔ ٹرانسسٹر ملتے ہیں۔ ٹیلیویژن، کیمرے، کاریں ملتی ہیں۔ حتیٰ کہ ڈھونڈنے والے کو گیشائیں بھی مل جاتی ہیں۔ یہ تو معمولی گولیاں ہیں۔ ہمارے ہاں تو کہیں سے بھی لے لو۔ چاہے اصلی لے لو۔ چاہے نقلی لے لو۔ بولے۔ بات یہ ہے کہ جاپان میں ملیریا ہی نہیں ہوتا۔ ڈائریا یعنی اسہال

کی کوئی دوا بھی نہیں ملتی کیونکہ وہ بھی نہیں ہوتا۔ ہمیں یہ سوچ کر یک گونہ خوشی ہوئی کہ ایک دو چیزیں تو ایسی نکل آئیں جو جاپانیوں کے پاس نہیں ہیں۔ جب کہ ہمارے ہاں بمقدارِ وافر ہیں، حتّٰی کہ دساور کو بر آمد کی جاتی ہیں۔ ویسے اور بھی کئی چیزیں یہاں نہیں ہوتیں۔ عامل کامل۔ سوالاکھ سنیاسی بابے۔ معجونوں کے انبار اور کُشتوں کے پُشتے لگانے والے خاندانی حکیم۔ بواسیر کے چھلّے دینے والے چین ہیلتھ سینٹر۔ انڈونیشی دواخانے، جرمن فارمیسیاں۔ شربتِ فولاد کا ہم نے نہیں پوچھا کیونکہ جانتے تھے یہ لوگ سارا فولاد مشینیں وغیرہ بنانے میں ضائع کر دیتے ہیں۔ عطّار بالخصوص صاحبِ اولاد عطّار بھی یہاں نہیں ہوتے۔ میر تقی میرؔ یہاں آئے تو اُن کا چار دِن بھی گزارہ نہ ہو سکتا تھا۔ خود ہم نے ایک آدھ جگہ شربتِ صندل، شربتِ بزوری، شربتِ وصل وغیرہ مانگا لیکن ٹکہ سا جواب ملا۔ یہاں ملیریا نہیں ہے تو ظاہر ہے مچھّر بھی نہیں ہوں گے۔ ڈائریا نہیں ہے تو مکھّیاں بھی نہیں ہوں گی۔ مچھر اور مکھّیاں نہیں ہیں تو ظاہر ہے ٹوکیو کی کوئی میونسپل کارپوریشن بھی نہ ہو گی۔ اِس کا کوئی محکمۂ صفائی بھی نہ ہو گا۔ گلی کوچوں میں تالاب بھی نہیں ہیں مچھیروں کو مچھلیاں بڑی دُور سے پکڑ کر لانی پڑتی ہیں۔ اہلِ اسلام کی آبادی کم ہونا بھی اِس کا باعث ہو سکتا ہے کیونکہ نہ مسلمان ہوں۔ نہ قربانی کی اوجھڑیاں آنتیں سڑکوں پر

پھینکیں نہ ان میں کیڑے چلیں۔ حکومت والے لوگوں کی صحت کی پرواتو کرتے ہیں لیکن مور و مگس کا یہاں کوئی پُرسانِ حال نہیں۔ قصّہ مختصر اِتنے ترقّی یافتہ مُلک میں ملیریا نہ پاکر ہمیں تعجّب ضرور ہوا لیکن پھر شیخ سعدی کی بات یاد آئی کہ ع

آنان را کہ این وہند آں نہ دہند

مچھروں مکھّیوں کے علاوہ ستر ڈھانپنے کا انتظام اور التزام بھی ہم نے اپنی توقّع سے کم پایا۔ لوگ عموماً صراطِ مستقیم سے بھٹکتے رہتے ہیں۔ آج ہی ٹیلی ویژن پر پھر ہمیں بے شرمی کا وہ کھیل PM11 دیکھنا پڑا جسے ہم نے پہلے کیوٹو میں دیکھا تھا اور قارئین کو یاد ہو گا کہ اِس کما حقہ مذمّت کی تھی۔ اِس میں انسانی جسم کی ساخت دِکھائی جاتی ہے۔ بالعموم طبعی جغرافیے کے نقطۂ نظر سے۔ سطح مرتفع جزائر، جنگلات، آتش فشاں، مقامات وغیرہ۔ مردانہ جسموں میں یہ چیزیں زیادہ نمایاں نہیں ہوتیں لہٰذا ہم ذرا کھنکار لیں اور آپ لاحول پڑھ لیں۔ آج ہم کُچھ تخلیقی کام کر رہے تھے اور نیند بھی آرہی تھی لیکن اُسے آخر تک دیکھنا پڑا۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ بے شرمی کی کوئی حد بھی ہے۔ چھِی چھِی۔ ایسی ایسی گندی باتیں؟ ہمیں اندیشہ ہو گیا ہے کہ کہیں اِن کی تہذیب بھی اپنے ہی خنجر سے آپ خودکُشی نہ کرلے۔ جاپان کو یہ خیال کرنا چاہیے کہ یہ آخر مشرق کا مُلک ہے اور مشرق کی کُچھ اخلاقی اقدار ہوتی ہیں۔ ہم مولانا حالیؔ

کی نظم اے ماؤں بہنو بیٹی اور علامہ راشد الخیری اور ڈپٹی نذیر احمد کی کتابیں جاپانیوں کو دے آئے ہیں کہ اِن کے ترجمے کراؤتو اب بھی اخلاقی گراوٹ اور عذابِ قبر سے بچ سکتے ہو۔ اتّفاق سے مشہور اُردو کتاب "موت کا منظر مرنے کے بعد کیا ہو گا" کی ایک جلد بھی ہمارے پاس تھی۔ اِس کتاب میں فاضل مصنّف نے چشم دید حالات لکھے ہیں۔ اِس کی بہت سی فوٹو اسٹیٹ کاپیاں نکلوا کر ہم نے جگہ جگہ بھجوادیں۔ اگر مخدومی مولانا رازق الخیری ماہنامہ عصمت کا جاپانی ایڈیشن چھاپنا شروع کر دیں تو یہاں بھی بد راہی کا اِسی طرح انسداد ہو سکتا ہے جیسے ہمارے وطن عزیز میں ہو گیا ہے۔ وہ عند الہ ماجور ہوں گے۔

اگر بینی کہ نابنیا و چاہ است

اگر دستش نہ گیری ایں گناہ است

شہر مندوں کا اور بندوں کا

اب کے نکو میں خُوشی محمد ناظرؔ ہمیں بہت یاد آئے۔ نکو ایک شہر ہے عالم میں انتخاب۔ ریل سے ٹوکیو سے دو گھنٹے کی راہ کِس طرف کو کِدھر کو یہ تو ہم بتا نہیں سکتے۔ لیکن پہاڑی مقام ہے۔ اپنے قُدرتی حُسن و خوبی کے لئے مشہور۔ جاپان میں ایک کہاوت ہے۔

نب لگ نہ بولو کگّو

جب لگ نہ دیکھو نِکّو

"نکّو" کا مطلب ہے لاجواب۔ ونڈر فُل۔ یہاں کا یہ ہمارا تیسرا پھیرا ہے۔ پہلی بار آج سے ساڑھے دس برس پہلے ۱۹۶۶ء کی مئی میں آئے تھے۔ وہ دِن بہار کے اور صنعت کرد گار کے تھے۔ ہر شاخ پہ تھی شگوفہ کاری۔ اب کے سردی اور سردی سی سردی۔ ٹوکیو بھی سرد ہے۔ لیکن یہاں تو آنے والے کی قلفی جمتی ہے۔ ہم اب کے نکّو کے جس ہوٹل میں اُترے یہ ایک صدی سے پرانا ہوٹل ہے۔ ۱۸۷۳ء میں قائم کیا گیا تھا۔ اگر یہ تاریخی حقیقت ہمیں کوئی نہ بھی بتاتا تو بھی اِس کی ساخت اور ساز و سامان سے ہم اندازہ لگا لیتے۔ دالان در دالان، زینہ در زینہ، سُرنگ در سُرنگ، غُلام گردش در غُلام گردش، ساتواں دروازہ کہیں جا کر ہمارے کمرے میں کھلتا ہے۔ ہوٹل کے سو سال پُرانا ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ فرنیچر بھی سو سال پرانا ہے۔ اِس دوران میں کم از کم ایک بار ضرور بدلا گیا ہو گا۔ بہر حال ہم نے سامان کا تھیلا کمرے میں پھینکا اور وحشت میں مٹر گشت کو نکل گئے۔ ڈھلان اُتر کر بازار۔ بازار سے بائیں ہاتھ مُڑ کر چوک۔ وہاں سے بائیں ہاتھ کی گلی جو دریا کے ساتھ ساتھ جاتی ہے۔ ایک جگہ گہرائی میں اُتر کر ہم عین دریا کے تٹ پہ جا نکلے۔ بلکہ برفانی پانی میں ہاتھ دھوئے۔ تھوڑی احتیاط ضرور رکھی کہ جان سے ہاتھ نہ دھو بیٹھیں۔ یہی مقام

تھا جہاں خُوشی محمد ناظرؔ اور اُن کا جوگی ہمیں یاد آتے۔ یہ نظم ہماری محبوب نظم ہے۔ جانے کیسے ہمارے بستے میں یہاں بھی چلی آئی۔ ہم نے تو خیر اپنی درسی کتاب مرقّع ادب میں پڑھی تھی۔ لیکن جس صورت میں ہمارے پاس سے نکلی، اُس کا سرنامہ لکھا ہے۔ ''تصنیف خان بہادر چوہدری خُوشی محمد ناظر بی اے ریٹائرڈ منسٹر ریاست جموں و کشمیر، حسبِ فرمائش خان بہادر آنزیبل عبد القادر صاحب جج ہائی کورٹ پنجاب، پریذیڈنٹ آل انڈیا مشاعرہ لاہور منعقدہ ۲۷ دسمبر ۱۹۳۲ء تحریر یافت'' یہ نسخہ بااہتمام مینجر رسالہ نیرنگ خیال شاہی محلہ لاہور چھپا۔ ویسے یہ نظم ۱۹۰۲ء میں لکھی گئی تھی جب مصنّف جو علامہ اقبال کے دوستوں اور ہم سبقوں میں سے تھا، کشمیر میں سِلسِلۂ ملازمت تازہ وارد تھا۔

چیلوں نے جھنڈے گاڑھے تھے پربت پر چھاؤنی چھائی تھی

تھے خیمے ڈیرے بادل کے کُہرے نے قنات لگائی تھی

یہاں بھی چیلوں یعنی چیڑ اور سفیدے کے پیڑوں کا جنگل ہے اور چھاؤنی سی چھائی ہے۔ لیکن اتّفاق سے آج نہ بادل ہے نہ کُہرا ہے۔ تیسری تاریخ کے چاند کی اچھی خاصی پھانک آسمان پر نظر آرہی ہے۔ یہاں ناظر کی نظر کا سارا سامان تو بہم نہ تھا

کوئی جوگی بھی نہ تھا ہمارے سوا جِس نے راکھ جٹا میں ڈال رکھی ہو اور انگ بھبوت رمایا ہو اور جس کے ایک لنگوٹی زیبِ کمر ہو جو گھٹنوں تک لٹکائی ہو۔ اِس موسم میں جوگی یہاں آن بیٹھے تو صُبح تزک و احتشام سے اُس کی اکڑی ہوئی لاش اُٹھانی پڑے۔ ہمیں پُرانی نظم کی یاد دلانے والا شعر یہ تھا کہ یہ منظر ہم نے پڑھا تو تھا، دیکھا اب اگر نکو میں۔

یہاں برف کے تودے گلتے تھے، چاندی کے فوّارے چلتے تھے

چشمے سیماب اُگلتے تھے، نالوں نے دھوم مچائی تھی

قدرتی مناظر کے علاوہ یہ شہر اپنی بعض درگاہوں اور خانقاہوں کے لیے بھی مشہور ہے۔ بڑی بڑی دُور سے لوگ اِسے دیکھنے آتے ہیں۔ ہم نے جاپان میں پہلے سے اتنی درگاہوں اور خانقاہوں کی زیارت کررکھی ہے کہ شنتو اور بُدھ مت کے حساب سے ہمیں حاجی کہا جا سکتا ہے۔ آج پھر ہمارے ساتھی اِس سردی میں شام کے جھٹ پٹے میں ہمیں گھسیٹ کے لے گئے۔ خاصی چڑھائی چڑھنی پڑتی ہے۔ اِس سے پہلے قصبے کی گلیوں کے پیچ خم کی آوارہ گردی نے ہمیں یُوں بھی تھکا دیا تھا۔ یہاں کے مقدّس مقامات میں ذوق و شوق سے ہم وہ مندر دیکھنے جاتے ہیں جس کی پیشانی پر وہ

تین مشہور بندر رہتے ہیں جن میں سے ایک نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ چھوڑے ہیں۔ ایک نے کانوں پر۔ ایک نے مُنہ پر۔ اِس کی تعبیر عام طور پر یہ کی جاتی ہے کہ بُرا نہ دیکھو، بُرا نہ سُنو، اور بُرا نہ بولو۔ یہ فلسفہ بندروں کی حد تک تو ٹھیک ہو گا۔ لیکن انسانی کاروبار اِس سے نہیں چل سکتا۔ اِس لئے یہ حکمت زیادہ تر مندروں تک ہی محدود پائی گئی ہے۔ حالانکہ گاندھی جی نے اِن بندروں کے حوالے سے ان اصولوں کا پرچار کرنے کی بہت کوشش کی تھی۔ ایک زمانہ تھا جب کسی کو بندر کی اولاد کہہ دیا جائے تو بہت بُرا مانتا تھا، ہاتھا پائی پر اُتر آتا تھا۔ لیکن جب سے حضرت ڈارون نے شجرہ نکالا ہے بہت سے لوگ اِسے لازمۂ انسانیت سمجھنے لگتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ بعض لوگوں کو اِس شجرے کے صحیح ہونے میں شک ہے۔ اس کو اِن کی ناخلفی کہنا صحیح نہ ہو گا۔ اِن کے پاس بھی کوئی نہ کوئی دلیل اس کے خلاف ہو گی۔ لیکن بندر تو قریب قریب سب کے سب ڈارون کی اِس تحقیق پر ناخوش اور ناراض ہیں۔ وہ انسان کو اپنی اولاد ماننے سے یکسر انکاری ہیں حالانکہ اولاد نالائق بھی ہو تو آخر اولاد ہوتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ لوگ ہمارے نسب سے ہوتے تو اِن کے دُم ہوتی۔ انہیں کون بتائے کہ صاحبانِ اقتدار کے سامنے ہلاتے ہلاتے گھِس گئی ہے۔ پھر وہ کہتے ہیں کہ یہ ہماری اولاد ہوئی تو ایسی چھچھوری حرکتیں کبھی نہ کرتی۔ بندروں میں نابرابری اور

استحصال کہیں نہ ملے گا جب کہ اِنسان کا شعار ہی بندر بانٹ ہے۔ آج کل کے علما اِن تین بندروں کے آنکھ کان زبان بند رکھنے کی توجیہ یہ کرتے ہیں اور ہمارے بھی جی لگتی ہے کہ یہ انسان کی کرتوتیں نہیں دیکھنا چاہتے۔ کان پہ ہاتھ رکھنے کا مطلب ہے کہ اُس سے پناہ مانگتے ہیں، اُس کے لاف گزاف کو پسند نہیں کرتے۔ مُنہ پر ہاتھ رکھنے کا مطلب ہے کہ ع

ہے ادب شرط مُنہ نہ کھلوائیں

ڈارون تو ابھی جمعہ جمعہ کل کی پیدائش ہیں۔ پراچین ہندوستان کے ہندوؤں نے جو بزرگوں کا آدر کرنے کے لئے ہمیشہ سے مشہور ہیں مندروں کو اپنے صحیفوں میں بڑی عزّت کا استھان دیا ہے۔ ہنومان جی جن کی بہ پوجا کرتے ہیں۔ اپنی اصل سے بندر ہی تھے۔ پرانے خیال کے ہندو اب بھی بندروں کو تکلیف پہنچانا پاپ سمجھتے ہیں، البتّہ اُن کی مبیّنہ اولاد کو تکلیف پہنچانا اِن کے ہاں اتنا مذموم خیال نہیں کیا جاتا۔ ایسا تضاد اِس مُلک کی ساری پالیسیوں میں آپ کو ملے گا۔ ہم جو نکو کے بندروں کو بار بار دیکھنے جاتے ہیں اِس میں تفاخر وغیرہ کے جذبے کو دخل نہیں ہے۔ ہم پدرم سُلطان بود کے ہرگز قائل نہیں ہیں۔ ڈارون کو چاہیے تھا کہ اپنی رائے دینے اور فلسفے بگھارنے سے پہلے کسی بندر سے بھی پوچھ لیتا کہ بتا تیری رضا کیا ہے۔ وہ انکار کر

دیتا تو حق بجانب ہوتا کیونکہ آپ نے کبھی سُنا ہے کہ کوئی اپنے اسلاف کو پکڑ کر پنجرے میں بند کر دے۔ ہمارا اشارہ شاہ جہان کے قصّے کی طرف نہیں ہے، چڑیا گھر کی مثال دے رہے ہیں۔ اگر بندر میاں کو معلوم ہوتا کہ انسان نہ صرف اُسے پنجرے میں بند کرے گا۔ بلکہ ڈُگڈگی بجا کر بازار میں تِگنی کا ناچ بھی نچائے گا تو روزِ اوّل سے فیملی پلاننگ کرتا۔ لیکن اب پچھتائے کیا ہوت۔

آج کی رات ایک الوداعی ڈنر ہوا۔ دو تین آدمی یونیسکو سے یا اپنی اپنی ملازمت سے رُخصت ہو رہے تھے۔ سبھی نے جذباتیت میں آکر کُچھ نہ کُچھ رویا گایا۔ ہم نے کہا بھئی ہم پہلے سے اُداس اور افسردہ ہیں۔ ہماری خاموشی کو صدا سمجھا جائے۔ ایک گیت لڑکیوں نے مل کر کورس میں بھی گایا۔ یہ ہمیں پسند آیا۔ اِسے کوئی حُسنِ طلب وغیرہ سمجھ لے تو اپنی ذمّہ داری پر سمجھے۔ ہم تو معصومیت سے نقل کر رہے ہیں اور ہماری معصومیت ہمیشہ شک و شُبہ سے بالا رہی ہے۔ اِس کے الفاظ انگریزی میں ہیں اور قافیے کے التزام کی وجہ سے لُطف بھی انگریزی ہی میں آئے گا۔ کسی اُردُو خواں کو بہت جُستجُو ہو تو کسی سے ترجمہ کرائے۔ ہدایت یہ ہے کہ ذرا لہک کر پڑھا جائے بطرزِ ع

جب پیار کیا تو ڈرنا کیا

Darling you can love one and still can have fun.

Darling you can love two, and still be true.

Darling you can love three, and still can be free.

Darling you can love four and still can love more.

Darling you can love five, and still be alive.

Darling you can love six and still not be sick.

Darling you can love seven, and still go to heaven.

Darling you can love eight, and still can walk straight.

Darling you can love nine, and still be mine.

Darling you can love ten, but not eleven.

آپ کہیں گے کہ گیارہ سے آگے بھی تو گنی ہے۔ لیکن آخر فراخ دِلی کی کوئی حد ہوتی

ہے۔ دس تک اجازت دے دینا بڑی بات ہے۔ رقیبوں کی پوری الیون سے ایک آدمی کا میچ کرانا زیادتی ہے۔ ہم نے یہ نظم نقل تو کر دی ہے۔ لیکن اب ڈر رہے ہیں کہ اِسے کوئی سند نہ سمجھ لے اور اپنے حقوق کے مطالبات میں شامل نہ کر لے۔ عائلی قوانین میں ایک کی پابندی ضرور لگا دی گئی ہے لیکن وہ صرف شادی پر ہے، محبّت وغیرہ پر نہیں۔ کوئی معقول آدمی اور عورت شخصی آزادی پر ایسی پابندی پسند بھی نہ کرے گا۔

ایک پلنگ خالی ہے

نکّو میں شب گزارنے کے بعد آئے تو ہم نے ٹھکانا بھی بدل لیا۔ فیئر مونٹ اچھّا ہوٹل تھا لیکن ہمارے سارے ساتھی جو دوسرے مُلکوں سے آئے تھے اب رُخصت ہو رہے تھے۔ صرف ہمیں ٹھہرنا تھا۔ پس دوستوں کے مشورے سے طے ہوا کہ ایشیا سینٹر میں ٹھہرو۔ یہاں بھانت بھانت کے لوگوں سے ملاقات بھی ہو گی۔ دام بھی کُچھ کم ہیں۔ یہاں بغیر غُسل خانے کا کمرہ لیجئے جس میں صرف پلنگ اور بستر ہوتا ہے تو خاصا سستا ہے لیکن ہم نہانے دھونے والے آدمی ہیں۔ ہم نے باتھ روم

والا اور دو بیڈ والا کمرہ پسند کیا۔ ایک پر لیٹتے ہیں دوسرے پر حسرت سے نظر کرتے ہیں۔ ایک سردار جی نے بھی تو اپنی کوٹھی میں تین تالاب بنوائے تھے اور لوگوں کو فخر سے دِکھاتے تھے کہ دیکھئے اِس تالاب میں ہمیشہ ٹھنڈا پانی رہتا ہے اور اِس دوسرے تالاب میں ہمیشہ گرم پانی رہتا ہے۔ جب ٹھنڈے پانی سے نہانے کو جی چاہے اِس میں ڈُبکی لگا لو۔ جب گرم پانی سے نہانا ہو تو اِس دوسرے میں چھلانگ لگا لو۔ تیسرا تالاب بالکل خالی تھا۔ ایک صاحب نے پوچھا کہ بادشاہو۔ یہ تیسرا کاہے کے لئے ہے۔ بولے ہم اپنی مرضی کے مالک ہیں۔ کبھی نہیں بھی نہانے کو جی چاہتا۔ پس اس دوسرے پلنگ کی حکمت بھی یہی سمجھئے کہ کبھی نہیں بھی اِس پر لیٹنے کو جی چاہتا۔ جس طرح پطرس کی سائیکل میں سارے چھید میل اور امتدادِ زمانہ سے بند ہو جانے کے باعث کُپّی کا تیل باہر ہی باہر رہ گیا تھا۔ تاہم اپنی تسلّی کے لئے آپ نے فرمایا تھا۔ کہ یوں بھی مُفید ہوتا ہے۔ ہم بھی کہیں گے کہ دوسرا پلنگ کمرے میں خواہ خالی ہی رہے، مُفید ہوتا ہے۔

شاید کہ پلنگ خفتہ باشد

یعنی آیا بود کہ گوشۂ چشمے بما کنند

یُوں اِس کمرے میں خُدا کا دیا سب کُچھ ہے۔ لکھنے کی میز ہے جس پر بیٹھے ہم لکھ رہے ہیں۔ ٹیلیفون بھی ہے۔ ٹیلی ویژن البتّہ نہیں ہے۔ ٹیلیویژن نہیں ہے تو ظاہر ہے 11 PM کا اخلاق سوز پروگرام بھی نہیں ہے جس کی جتنی بھی مذمّت کی جائے کم ہے۔

ایمان بچ گیا مِرے مولا نے خیر کی

ویسے نیچے لاؤنج میں ٹیلیویژن رکھا ہے

ہم اُدھر سے گُزرے تھے۔ بہت سے لوگ زیادہ تر افریقی بیٹھے اپنے ایمان خراب کر رہے تھے۔ ایک سے ہم نے پوچھا تمہارا دین کیا ہے۔ اُس نے کُچھ زولو یا جو جو وغیرہ بتایا۔ ہم نے کہا تمہیں اپنی عاقبت کی فکر نہیں۔ ننگی ٹانگوں والی فلمیں دیکھنے سے گناہ ہوتا ہے۔ اِس سے زیادہ برہنگی دیکھ لو تو سیدھے دوزخ میں۔ بولے دوزخ کیا ہوتا ہے۔ ہمیں کُچھ زیادہ علم تو نہیں، ہم خود وہاں کبھی نہیں گئے، لیکن اِن کو بتایا کہ آگ وغیرہ جلتی ہے اور برچھے وغیرہ مارتے ہیں اور کوڑے وغیرہ لگاتے ہیں۔ بولے جس طرح روڈیشیا میں ظُلم ہو رہا ہے۔ اِس طرح؟ ہم نے کہا وہ تو کُچھ بھی نہیں۔ بڑی سخت سزائیں دیتے ہیں۔ ہم نے بتایا کہ ہمارے دوزخ کی طرح عیسائیوں کے ہاں بھی جہنّم ہوتا ہے، وہاں گناہ کرنے والے عیسائیوں کو بھیجتے ہیں۔ حتّٰی کہ ہندوؤں

کے ہاں بھی نرک ہوتا ہے۔ جو ہندو پاپ کرتے ہیں اُن کو نرک میں بھیجتے ہیں۔ ہم نے تھوڑی تبلیغ بھی کی کہ اِن سب میں ہمارا مذہب مقابلۃً اچھا ہے۔ اِس میں آگ میں دوزخی کو بھونتے تو ہیں لیکن ذرا نرم آنچ پر اور نہ گناہ کرو تو بالکل بھی نہیں بھونتے۔ اہلاً و سہلاً کر کے جنّت میں بھیج دیتے ہیں۔ اب اُس نے جنّت کے بارے میں سوال کیا۔ اس کا بھی ہم نے گول مول جواب دیا کیونکہ وہاں بھی ہم کبھی نہیں گئے۔ ہنس کر بولے۔ ہم اپنے مذہب ہی میں کیوں رہیں جس میں دوزخ اور نرک وغیرہ کُچھ بھی نہیں ہوتے۔ ہم اُسے کیا جواب دیتے۔ اُس پر ترس آیا کہ دیکھو اِس کے مذہب میں کوئی گناہ کرے، تو کوئی ایسی جگہ نہیں جہاں وہ جا سکے۔ ہم اپنے دوزخ کی پیشکش کرنے کو تھے لیکن پھر یاد آیا کہ وہ تو ہماری اپنی ضرورتوں کے لئے کم پڑ رہا ہے۔ غالبؔ نے اِس کی توسیع کی تجویز پیش کی تھی کہ

کیوں نہ جنّت کو بھی دوزخ میں ملا لیں یا رب

سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی

لیکن شاعر کی بات پہ کون توجّہ دیتا ہے۔ ایک لطیفہ بھی یاد آ گیا کہ ایک پنڈت ہر روز بھگوان کی مُورتی پر پھول چڑھاتا تھا اور ایک مُسلمان روز اِس مُورتی کے ایک

جو تا لگا تا تھا۔ ایک روز پنڈت نے مُورتی سے کہا، ہے بھگوان، تو اِس مُسلے کو نِشٹ کیوں نہیں کر دیتا جو تیری اِتنی بے عزّتی کرتا ہے۔ ہم سے ذرا سی غَلَطی ہو جائے تو ہم پر شیر ہو جاتا ہے۔ بھگوان نے کہا۔ اِے مُورکھ۔ ہم اُسے کیسے نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ وہ کوئی ہم کو مانتا ہے؟ اِس افریقی شخص کی اِس قسم کی سوچ مُلحدانہ گُفتگُو سے ہماری طبعیت اتنی منغّض ہوئی کہ ہم بھی تھوڑی دیر کو PM11 دیکھنے کے لئے بیٹھ گئے۔ کمرے میں سامان رکھ کر لِفٹ سے اُترے تو دیکھا کہ دو سادُھو لابی میں گھوم رہے ہیں۔ ہم نے قریب جا کر دیکھا۔ ایک تو کالا تھا۔ دوسرا گورا تھا۔ دونوں کے لانبی لانبی داڑھیاں، سر پر گیر وا پگڑیاں اور بر میں گیر والا بُنے کُرتے۔ بھگوان کے ہاں تو دونوں کا درجہ ایک سا ہو گا، لیکن ہمیں گورا زیادہ ہونّق دِکھائی دیا۔ عجب اتّفاق ہے۔ ابھی کل ہی ہم نے انگ بھبوت رمانے والے جوگیوں کو یاد کیا تھا۔ لیجئے یہاں مل بھی گئے۔ ہم نے کالے صاحب سے کہا کہ سادھو مہاراج کہاں کے رہنے والے ہو۔ بولے شمالی ہندوستان کا۔ ہم نے کہا شمالی ہندوستان میں کہاں کے۔ یہ اِس لیے پوچھا کہ سِکھ نظر آ رہے تھے۔ بولے ہری دوار کا یعنی ہر دوار کا۔ انہوں نے اپنے ساتھی سے تعارف کرایا کہ یہ امریکی ہیں اور مشرف بہ سادھو پن ہونے کے بعد اِن کا نیا نام بابا کِشن داس ہے۔ انہوں نے ہمارا اتا پتہ بھی پوچھا اور کہا کل ہماری میٹنگ

ہو رہی ہے آپ کو بھی بلائیں گے۔ ہم نے کہا ہاں ضرور۔ ہماری آتما کو بھی شانتی اور نروان کی تلاش ہے۔ سادھو بننے کا مُدّت سے ہمارا اِرادہ ہے اور بھگتی کی طرف ہمارا طبعی رُجحان ہے۔ لیکن داڑھی ہم بڑھانا نہیں چاہتے اور یہ گہرا زعفرانی رنگ ہم پر کھِلتا نہیں۔ ہمارے ہاں لڑکے بھی شرارتی ہیں۔ ہم پر ڈھیلے پھینکیں گے۔ کُتّے بھی بھونکیں گے۔ دُنیاداری کو تیاگنے کا عزمِ صمیم تو ہے لیکن تعجیل کے ہم قائل نہیں۔ اپنے پروردگار سے بھی دُعا کُچھ ایسے الفاظ میں کرتے ہیں کہ ہمیں پارسا بنا اور گُناہوں سے بچا لیکن آج نہیں۔

"GOD MAKE ME PIOUS BUT NOT TODAY"

یہ ہردوار والے تو ہردوار والے تھے۔ اِس امریکی پر ہمیں رحم آیا۔ پار سال ہانگ کانگ میں ہم نے پڑھا تھا کہ ایک امریکی گھرانا سِکھ ہو گیا ہے۔ پچھلے دِنوں ایک صاحب نے جو مشرقِ وسطیٰ کے ایک چھوٹے عرب مُلک سے آئے تھے ہمیں بتایا کہ وہاں کُچھ سِکھ بھی کام کرتے ہیں۔ اُس ریاست میں نماز کے باب میں اتنی سختی برتی جاتی ہے کہ سپاہی نماز کے وقت کوڑے لے کر نکل آتے ہیں اور سب سے کہتے ہیں کہ چلو صلوٰۃ صلوٰۃ۔ سِکھّوں نے شکایت کی کہ ہم عُذر کرتے ہیں کہ ہم تو سِکھ ہیں۔ وہ ہمیں کوڑے مارتے ہیں کہ سِکھ ہو تو کیا ہے۔ نماز سب پر فرض ہے۔ تُم

لوگوں نے تو اتنی لمبی لمبی داڑھیاں بڑھا رکھی ہیں۔ تُم پر تو اور زیادہ فرض ہے۔ چنانچہ ہمارے دوست سے اِن سرداروں نے پوچھا کہ جی ہمیں تو آپ سِکھ کہتے ہیں، اِن لوگوں کو آپ کیا کہیں گے؟ یہ چُپ ہو رہے کیونکہ فی زمانہ جس مُلک میں تیل نکلتا ہو وہاں کے لوگوں کا احترام کرنا چاہیے۔ ورنہ اُن کو زبردستی اپنا احترام کرانے کے طریقے بھی آتے ہیں۔

ہم تو جب بھی جاپان سے ہو کر گئے اِن لوگوں کے پہلے سے زیادہ قائل ہو کر گئے۔ شائستگی تو اِن کی بے مثال ہے ہی۔ باقی خوبیوں کا بھی ہم تذکرہ کر چُکے کہ پورا تولتے ہیں۔ لڑکیوں کے دوپٹے نہیں کھینچتے۔ اُن کے پرس نہیں اُڑاتے۔ بسم اللہ بلڈ نگیں نہیں بناتے۔ دُودھ میں پانی، مکھّن میں گریس نہیں ملاتے۔ صفائی کا یہ خیال کہ کیا مجال سڑک پر ایک پُرزہ یا تنکا بھی نظر آ جائے۔ شاید اِس کی وجہ یہ ہو کہ یہاں جمعدار در جمعدار نہیں ہوتے۔ اُن پر داروغے نہیں ہوتے۔ اِن پر انسپکٹر نہیں ہوتے۔ اِن پر درجہ بہ درجہ صحت کے دوسرے حکّامِ عالی شان نہیں ہوتے۔ یہ سچ ہے کہ ہمارا رُحجان ظاہری صفائی سے زیادہ باطنی صفائی کی طرف رہتا ہے اور وہ زیادہ ضروری بھی ہے اور اِس کے لئے ضربیں لگانی پڑیں تو لگانی چاہئیں بشرطیکہ شدید نہ ہوں، خفیف ہوں، اور اپنے پر لگائی جائیں، کسی دوسرے پر نہیں۔ تاہم اے خانہ بر

اندازِ چمن کُچھ تو اِدھر بھی۔

امریکہ بہت بڑا ملک ہے۔ اِس کے وسائل بے شمار بلکہ ناپید اکنار ہیں۔ کولمبس نے اِسے دریافت کیا تو یہاں جانگلی لوگ رہتے تھے۔ ٹیلیفون کرنے اور تار بھیجنے کی بجائے دھوئیں کے سِگنل بھیجتے تھے۔ باہر کے گوروں نے آ کر اِن جانگلیوں کا سدِّباب کیا اور اب وہ فقط سروں پر پنکھ لگا کر اور چہرے پر لکیریں کھینچ کر فِلموں میں اجتماعی ولین کا کام کرنے کے لائق ہی رہ گئے ہیں۔ روس کے بھی بے پناہ وسائل ہیں۔ یہ بھی دُنیا کی سُپر پاور ہے لیکن جاپان کیا تھا فقط اِک جزیرہ نما تھا۔ بلکہ جزیرہ نما بھی نہیں محض جزیرہ۔ یہاں معدنی وسائل کُچھ بھی نہیں۔ تیل باہر سے منگاؤ۔ لوہا باہر سے منگاؤ۔ تس پر اتنی ترقّی کہ ساری دُنیا پر چھا گئے۔ ساری دُنیا میں اِن کی کاریں دوڑتی پھرتی ہیں۔ اِن کے کیمرے ماہ رُخوں کی تصویریں کھینچتے ہیں۔ اِن کے ڈانسر لوگوں کی سامعہ نوازی کرتے ہیں اور اِن کے ٹیلیویژن۔ یہاں ہمیں PM 11 پھر یاد آ گیا ؎

اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے

ایجادیں یہ کریں۔ مشینیں یہ بنائیں۔ ساری دُنیا پر یہ چھائیں۔ محض اپنی ذہانت اور

محنت اور تربیت کے طفیل ہم اپنے ہاں کے لوگوں کو ولایت بھیجتے ہیں اور وہ جاتے ہی تانگوناچنے لگتے ہیں۔ اگر کچھ سیکھنا ہو تو جاپان بھیجو۔ صرف تکنیک سیکھنے کے لئے نہیں۔ یہاں کے لوگوں کے اوضاع و اطوار سیکھنے کے لیے، محنت اور ذمّہ داری کی عادت سیکھنے کے لئے، باضابطگی اور شائستگی سیکھنے کے لئے۔ ہم نے ٹوکیو سے نواحات کی طرف جاتے ہوئے جابجا خوبصورت چھوٹے چھوٹے مکانات دیکھے، لکڑی کے ڈھانچوں اور سستی پلاسٹک کی چادروں کے بنے ہوئے۔ خود ہم نے اپنے کمرے کا غُسل خانہ دیکھا جھوٹا ہے۔ لیکن سارا ایکجان ہے۔ یعنی اِس میں ٹب، کموڈ، واش بیسن حتّیٰ کہ فرش اور دیواریں بھی الگ الگ نہیں بنی ہیں۔ ایک ہی یونٹ ہے کسی دھات کا بنا ہوا۔ اوپر روغن چڑھا ہوا۔ مکان بنانے کے ڈھنگ اِن سے سیکھو۔ فریم کے لئے بس اینگل آئرن کو ویلڈ کر لیتے ہیں۔ تھوڑی لکڑی لگا لی۔ ایک جگہ ایک مکان کنکریٹ کی اینٹوں کا نظر آیا۔ ہم نے ٹھوکا دیا تو معلوم ہوا مصنوعی کنکریٹ ہے۔ نہایت ہلکا لیکن مضبُوط اور گرمی سردی سے بچاؤ کرنے والا۔ آج کی صنعتی ترقّی میں انگریز اور امریکی اور جرمن کوئی حرفِ آخر نہیں ہیں۔ ع

کہ اِس دیار میں سودا برہنہ پا بھی ہے

ہم چین کے حوالے دیتے تھے۔ وہاں کے فلسفۂ زندگی سے لوگ ڈرتے ہیں کہ زیادہ

جائید ادیں بنانے سے منع کرتا ہے۔ اچھا بھئی جاپان کو دیکھ لو، کسی سے تو کوئی مت سیکھو۔ خالی گنڈے تعویذ سے تو کسی قسم کی ترقّی ہونے سے رہی۔ ہم اپنے ہاں کے عاملوں، کاملوں کی دل آزاری کے لئے معذرت خواہ ہیں لیکن ہمیں تو یہ صاف سُتھرے محنتی ذہین ایمان دار لوگ اچھّے لگے۔ چین کے ساتھ مُقابلہ تو ہم نہیں کرتے لیکن یہاں بھی آپ ہوٹل کے کمرے میں تالا نہ لگائیں یا لگانا بھول جائیں اور اپنی کار بازار میں کھُلی چھوڑ دیں تو کسی قسم کے نقصان کا احتمال بہت کم ہے۔ ہاں انگریزی اور وہ بھی با محاورہ اور اہلِ زبان کے لہجے میں اِن لوگوں کو نہیں آتی۔ یہی نُقص ہم تسلیم کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں کے لوگوں کو اور کوئی چیز آئے نہ آئے انگریزی ضرور آتی ہے بلکہ انگریزوں سے بھی کُچھ زیادہ ہی آتی ہے۔ بعض اوقات تو انگریز سمجھ نہیں پاتے تو ہمارا مُنہ تکتے رہ جاتے ہیں۔

البتّہ بلڈوزر کو تالا لگا کر رکھیں

ہم نے اُوپر ذکر کیا تھا کہ یہاں چوریاں شاز ونادر ہوتی ہیں۔ لہٰذا کمرے کو یا کار کو تالا نہ لگائیں تو بھی حرج نہیں۔ لیکن آج کے اخبار میں ایک اور طرح کی خبر نظر آئی۔ یوِکوہاما میں جو ٹوکیو سے زیادہ دور نہیں اور بندر گاہ ہے۔ اِن معنوں میں نہیں جن میں نِکّو کا شہر ہے اور جس کے بندروں کا ہم نے ذکر کیا تھا بلکہ سی پورٹ کے معنوں میں۔ تین چوروں نے مل کر بلڈوزر اور مٹّی کھودنے والی دوسری پچاس بھاری مشینیں اور کرینیں چُرا لیں۔ بلکہ اُن کو جنوبی کوریا اور تائیوان کو بر آمد بھی کر دیا۔ اِس بر آمد

سے مُلک کو جو زرِمبادلہ ملا ہو گا یہاں کی حکومت نے اُس کی کُچھ قدر نہیں کی۔ بونس واؤچر نہیں تو خُوشنُودی کا سرٹیفکیٹ ہی دیا ہوتا۔ البتّہ ہاتھ دھو کر اُن کے پیچھے پڑ گئی ہے۔ دو تو پکڑے بھی جا چُکے ہیں۔ ہمارے مُلک میں جو لوگ بر آمدات بڑھانے کی سعی کرتے رہتے ہیں اُن کو سب سے سبق سیکھنا چاہیے۔ دوسرا سبق یہ سیکھا جا سکتا ہے کہ آپ جاپان میں رہتے ہوئے سائیکل سکوٹر، کار اور ہوٹل کے کمرے کو بے شک تالا نہ لگائیں۔ البتّہ آپ کے پاس کوئی سڑک کوٹنے کا انجن یا پہاڑ کاٹنے کی مشین یا بھاری کرین ہے تو اُسے ضرور تالا لگا کر رکھیں ورنہ اگر کسی نے انہیں جاپان کی اکانومی کو، یا اپنی اکانومی کو مضبُوط بنانے کے لئے جنوبی کوریا یا تائیوان کو بر آمد کر دیا تو ہم ذمّہ دار نہ ہوں گے۔

آج کی دوسری خبر یہ ہے کہ یہاں بعض ساہوکار پکڑے گئے ہیں۔ بلکہ ساہوکارے کی کمپنیاں کہیے۔ قصور یہ کہ سود بہت لیتی ہیں۔ مثلاً ایک کمپنی ہے جس نے گالف کِھلانے والی ایک فرم کو کروڑوں ین کا قرضہ دیا۔ کس حساب سے؟ دس فیصدی کے حساب سے۔ دس فیصدی سالانہ نہیں۔ وہ تو بلکہ اِس سے زیادہ تو سارے بینک بھی لیتے ہیں۔ دس فیصدی ماہانہ بھی نہیں جو ہمارے گاؤں کا بنیا لیتا تھا، بلکہ دس فیصدی فی دس روز۔ افسوس ہمارے پاس کیلکولیٹر یا کمپیوٹر نہیں جس سے بتا سکیں کہ سالانہ

سود مفرّد اور مرکّب کتنا بنا۔ لیکن یہ وارو گیر، ہماری سمجھ میں نہیں آئی۔ بھئی دینے والے نے دیا اور لینے والے نے لیا۔ اس کو کُچھ فائدہ ہوتا ہو گا تبھی تو لیا۔ حکومت کیوں بیچ میں ٹپک پڑتی ہے۔ ہمارے دیہات میں تو مول بیاج کا معاملہ بنئے کا اور کسان کا باہمی ذاتی معاملہ ہوتا تھا اور اگر اِس کی ادائیگی میں کسان کی فصل یا زمین رہن اور قرق ہو جاتی تھی یا دادا کا قرضہ بیٹا تک بلکہ نسل در نسل چلتا تھا تو یہ بھی کسان اور بیٹے کا باہمی معاملہ تھا۔ حکومت اِس میں دخل نہ دیا کرتی تھی۔ اِس لیے یہاں کی حکومت کا بالعموم مدّاح ہونے کے باوجود ہم نے اِس عمل کو جو لوگوں کی شخصی آزادی میں مداخلت کے مترادف ہے، پسند نہیں کیا۔ سود کو بذاتِ خود معیوب یا حرام وغیرہ بھی نہیں کرسکتے۔ کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو یہ ہمارے مُلک میں کیوں ہوتا۔ جہاں ہر چیز اسلام کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ہے اور جہاں ؎

خلافِ شرع کبھی شیخ تھوکتا بھی نہیں

پاکستان میں جو ہماری قسمت ہے وہ ہمیں شام کے اخباروں اور ہفت روزہ پرچوں سے معلوم ہوتی ہی رہتی ہے۔ کبھی کبھی جنتری خرید کر ہم سال بھر کی قسمت یک مُشت اور پیشگی بھی معلوم کرلیتے ہیں۔ خود ہمارے سامنے بندر روڈ کے فٹ پاتھ پر طوطے کی مدد سے اور اُس کے بغیر قسمت کا حال بتانے کا معقول اور باکفایت انتظام

ہے بلکہ ہمیں یہ اعتراف کرنے میں باک نہیں کہ امتحان اور مقدموں میں کامیابی افسروں کو رام کرنے اور محبوب کو اپنے قدموں میں لا ڈالنے کے بیشتر نُسخے ہم نے اِنہی لوگوں کے سامنے زانوئے ضرورت تہہ کرکے سیکھے ہیں۔ جاپان کے اخباروں میں بھی قسمت کا حال بتانے کا باقاعدہ انتظام ہے۔ ہم ۱۵ جون کو پیدا ہونے کے اعتبار سے جیمنئی یعنی برج جوزا کے ہیں۔ لکھا ہے کہ ستاروں کے اثرات کے تابع ہم اِس ہفتے میں اپنے شریکِ کار اور ساتھی کے تعاون سے بہت لابھ اُٹھا سکتے ہیں۔

غالباً ستاروں کو معلوم نہیں ہو سکا کہ ہم آج کل پاکستان سے باہر ہیں اور یہاں ہمارا کوئی شریکِ کار اور شریکِ حال نہیں ہے، بلکہ ہمارے کمرے کا دوسرا پلنگ تک خالی پڑا رہتا ہے۔ ہم سے تعاون نہیں کرتا۔ کُچھ عجب نہیں کہ یہ جاپان کے جیمنئی لوگوں کی قسمت کا احوال ہو کیونکہ یہ امر کسی سے پوشیدہ نہیں کہ جاپان اور پاکستان کے لوگوں کی قسمت الگ الگ ہوتی ہے۔ جیمینئی کے باب میں یہ بھی لکھا ہے کہ

"اگر تُم کسی جماعت میں شامل ہونے پر تُلے ہوئے ہو تو امکان غالب ہے کہ تُم کو اِس کا صدر، نائب صدر وغیرہ مُنتخب کر لیا جائے گا۔ تُم زرخیز دماغ کے آدمی ہو، تُم سے تمہاری جماعت کو بہت فیض پُہنچے گا۔"

ہر چند کہ ہم چوہدری نیک عالم ایم ایس سی زراعت کی بھُگھ کڈھ پارٹی میں شریک ہیں تاہم اگر کوئی اور جماعت ہمیں اپنی مجلسِ عاملہ میں لینے اور صدر وغیرہ بنانے کو تیّار ہو تو اپنے زرخیز دماغ سے فیض پہنچانے کے لئے ہم اُس میں شامل ہونے پر تیّار ہیں۔ ہماری خوش قسمتی یہ ہے کہ ہم جنوری میں بھی پیدا ہوئے تھے۔ ہمارے سرٹیفکیٹ پر تاریخ ۴ جنوری ہی کی لکھی ہے۔ غالباً ہم واحد آدمی ہیں جو بیک وقت دو مہینوں یعنی جنوری اور جون میں پیدا ہوئے تاکہ زمانے کی سردی گرمی دونوں کا مزہ چکھ سکیں۔ کبھی ہمارے مُلک کے رسالوں میں جیمینئ کی قسمت کا احوال ہمارے موافق نہ پڑے تو ہم خود کو دِلاسا دیتے ہیں کہ اصل تاریخِ پیدائش تو وہی ہوتی ہے جو سرکاری سرٹیفکیٹ میں درج ہے۔ والدین کا کہنا کُچھ سند نہیں۔ بھلا ہم جون کی گرمیوں میں پیدا ہو سکتے ہیں؟ ۴ جنوری کے حساب سے ہمارا بُرج جدّی یعنی کیپری کورن ہے۔ اِس میں لکھا ہے کہ

”تمہاری قسمت تمہاری نوکری کے حوالے سے جاگنے والی ہے۔ تمہیں تمہارے پیشے میں ترقّی ملے گی اور اگر بُرج جدّی میں پیدا شدہ کوئی شخص بے روزگار ہے تو اُس کو جلد از جلد وہ نوکری ملے گی جس کا وہ خواہاں ہے۔“

قارئینِ کرام اگرچہ جیمینئ کے طور پر بھی ہماری قسمت کُچھ بُری نہیں لیکن جنوری

میں ہمارا پیدا ہونا نا قابلِ ترجیح ہے۔ چونکہ جنوری یعنی ہماری سالگرہ کی تاریخ قریب آنے والی ہے۔ ہم قارئین کرام کو ابھی سے اِس کی مبارک باد دیتے ہیں۔ وہ اِس موقع پر جو تحفہ ہمیں دینا چاہیں، تکلّف کی ضرورت نہیں، بے تکلّف ہمیں بھیج سکتے ہیں۔ چونکہ ہماری طبیعت میں قناعت اور ایک طرح کا استغنا ہے اس لئے تحفہ جتنا زیادہ بھاری اور قیمتی ہو ہرج نہیں۔ شکریے کے ساتھ قبول کیا جائے گا۔ کیونکہ اصل چیز تحفہ نہیں، تحفہ دینے والے کا جذبہ ہوتا ہے۔

قصّہ ہمارے چیک اپ کا

ہمارے ہاں جتنے بڑے آدمی باہر جاتے ہیں اپنا میڈیکل چیک اپ ضرور کراتے ہیں۔ حتّٰی کہ اب کسی کو اُس وقت تک بڑا آدمی سمجھا ہی نہیں جاتا جب تک اُس کے بیرون مُلک چیک اَپ کرانے کی خبر نہ آئے۔ پس ہم نے اپنے دوستوں سے کہا کہ ہم بھی جاپان میں اپنا چیک اَپ کرائیں گے اور پاکستان کے اخباروں میں اُس کی خبر چھپوائیں گے۔ بولے تمہارا چیک اَپ کیا معنی؟ تمہارا دماغ خراب ہے کیا؟ ہم نے کہا جسم میں دماغ کے علاوہ بھی تو بہت سے اعضائے رئیسہ اور غیر رئیسہ ہیں جو خراب

ہو سکتے ہیں۔ اُن میں بعض تو دماغ سے زیادہ اہم ہوتے ہیں۔ دماغ کے بغیر تو کام چل جاتا ہے، بلکہ زیادہ اچھّی طرح چلتا ہے۔ دوسرے اعضا کے بارے ہیں آپ یہ نہیں کہہ سکتے۔ اُن میں سے بعض تو بڑے کام کے ہوتے ہیں۔

بولے چیک اَپ کے لئے پھر بھی کسی نہ کسی بیماری کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔ تمھیں کیا بیماری ہے ؟ خیر سے بھلے چنگے لگتے ہو۔ ہم نے پوچھا۔ اِن بڑے آدمیوں کو کیا بیماری ہوتی ہے۔ وہ ہم سے بھی زیادہ ہٹّے کٹّے ہوتے ہیں۔ پھر ہمیں کبھی کبھی دفتر میں کُرسی پر زیادہ دیر بغیر کام کے بیٹھے بیٹھے نقّاہت سی ہو جاتی ہے۔ ہمیں قبض کی بھی پُرانی شکایت ہے اور قبض آپ لوگ جانتے ہیں امّ الامراض کہلاتی ہے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ ہمارے اعصاب کو آرام کی ضرورت ہے۔ جو ہمیشہ عورت کے اُن پر سوار رہنے کی وجہ سے شل ہو گئے ہیں۔ لیکن آپ لوگ یہ ہم سے کیوں پوچھتے ہیں۔ چیک اَپ کا مطلب یہ ہے کہ ڈاکٹر ہمیں بتاتے کہ تمھیں کیا بیماری ہے۔ ہم کیوں بتائیں۔ بولے اِس پر پیسے بہت لگیں گے۔ فیس خاصی ہوتی ہے۔ اب ہمارا دِل ڈوبنا شروع ہوا۔ ہم نے کہا۔ پیسے کی بات ہم سے مذاق میں بھی نہ کیا کرو۔ ہمارا دِل ڈوب رہا ہے۔ اسپتال لے چلو۔ ایک صاحب نے کہا۔ وہاں کہیں ایسے ویسے اِرادے سے نہ جانا۔ ایک صاحب نے کہا وہاں ایسے ویسے سے کیا مطلب: بولے عاشقی وغیرہ۔

ہم نے کہالا حول ولا قوۃ۔ ہماری پوری زندگی گواہ ہے کہ ہم نے کبھی عاشقی وغیرہ نہیں کی اور سال خواتین کے بعد تواِس کی گنجائش بھی نہیں۔ حالیؔ سے عالیؔ تک سبھی نے نظموں نغموں میں ماؤں بہنوں بیٹوں ہی کا ذکر کیا ہے۔ کوئی اور خانہ بنایا ہی نہیں۔ ہاں میرؔ سے لے کر فیضؔ تک متقدمین کی اور بات ہے۔ انہوں نے بڑے التزام سے ماؤں بہنوں بیٹیوں وغیرہ کو اپنی شاعری سے خارج رکھا ہے۔

یہ اسپتال ٹوکیو یونیورسٹی سے ملحق ہے۔ یہاں کے ڈاکٹر باکمال مشہور ہیں۔ کہتے ہیں سب بہترین دماغ یہاں جمع ہیں۔ یہاں کے ڈاکٹروں نے بھی داخل کرنے سے پہلے ہم سے غیر متعلق سوال کیا کہ تمہیں کیا بیماری ہے۔ ہائے ہمارے ہاں کے حکم کسی کی چارپائی کے نیچے خربوزے کے چھلکے دیکھ کر حکم لگا دیتے تھے کہ مریض نے خربوزہ کھایا ہے۔ اِن کے ایک شاگرد نے البتّہ اِسی اصول پر ایک مریض کے پلنگ کے نیچے جوتوں کا جوڑا دیکھ کر یہ تشخیص کی کہ مریض نے جوتے کھائے ہیں۔ تو خود جوتے کھائے۔ یہ لوگ قارورہ دیکھ کر پوری کیفیت بھانپ لیتے تھے۔ ایک روز کوئی شخص کسی مرض کی شکایت لے کر آیا اور مریضوں کی قطار میں بیٹھ گیا۔ اتّفاق سے اُس کے ہاتھ میں اورنج جوس کی بوتل تھی جسے وہ گھر لے جارہا تھا۔ حکیم صاحب نے اِسی کو دیکھ کر بتادیا کر تمہارے پیشاب میں اور جسم میں صفرا کی زیادتی ہے اور

خلطیں غَلَط ملط ہو گئی ہیں۔ ایک اور حکیم صاحب کا کمال سُنا ہے کہ یہ پردہ نشینوں کی نبض یوں دیکھتے تھے کہ پردہ نشین کی کلائی پہ دھاگا باندھ دیا جاتا ہے اور دوسرا سِرا حکیم صاحب کے ہاتھ میں دے دیا جاتا تھا۔ ایک بار کسی شریر نے امتحاناً وہ دھاگا ایک بِلّی کی کلائی پر باندھ کر دوسرا سِرا حکیم صاحب کو تھما دیا۔ حکیم صاحب نے کہا مریضہ نے چھیچھڑے زیادہ کھائے ہیں جو ابھی ہضم نہیں ہوئے۔ بہر حال ڈاکٹروں نے ہمیں داخل کر لیا اور وہ سب کُچھ کیا جو اُن کو کرنا ہوتا ہے۔ مثلاً خُون لیا، ایکسرے لیا، بلڈ پریشر لیا، ٹمپریچر لیا، فیس لی۔ اور اتنی ساری چیزیں لینے کے بعد دیا کیا؟ صرف مشورہ کہ تمہیں وہم کی بیماری ہے۔ حکیم لُقمان کے پاس جاؤ۔ ہمارے بہت اِصرار پر انہوں نے ہمارے پاؤں میں چیرا دیا اور پٹّی باندھ دی۔ گویا سب سے پہلے ہمارے پاؤں ہی نبردِ عشق میں زخمی ہوئے۔ اب ہمارے دو پٹیاں ہو گئیں کیونکہ ہماری آنکھ پر تو پٹّی ہمیشہ ہی بندھی رہتی ہے۔

ڈاکٹر مجید رائنہ پشاور کے رہنے والے جوانِ رعنا ہیں اور کوئی اٹھارہ برس سے یہاں ہیں اور مشہور سرجن ہیں۔ ہمیں اُن کی اور امان اللہ سردار کی ضمانت پر داخل کیا گیا۔ پہلے ضمانت نہیں ہوا کرتی تھی۔ چنانچہ ایک مریض مہینہ بھر علاج کرا کے پچھلے دروازے سے فرار ہو گیا۔ ہمیں وہ پچھلا دروازہ بھی دِکھایا گیا جس سے وہ فرار

ہوا تھا۔ اپنے دوستوں کی ضمانت کا خیال نہ ہوتا تو شاید ہم بھی اِس نیک مثال پر عمل کرتے۔ ہر کمرے کے کونے میں ایک کیمرہ بھی لگا رہتا ہے۔ مریضوں کی حرکات و سکنات، خصوصاً حرکات دیکھنے کے لئے۔ اتّفاق سے ہمارے اِس کمرے میں بھی دوسرا بیڈ خالی ہے۔ اِس لئے سکنات زیادہ ہوتی ہیں۔

یہاں آکر معلوم ہوا کہ دُنیا میں کہیں بھی کوئی زبان جاننے کی ضرورت نہیں۔ یہاں کی نرسوں میں کوئی انگریزی نہیں جانتی۔ اِس کے باوجود ہم نے اشاروں کی زبان میں اُن سے پانی منگایا۔ تولیہ منگایا۔ دوسرا تکیہ منگایا۔ کھانے میں ذرا گڑبڑ ہے۔ ہمارے حلق سے جاپانی کھانا کم اترتا ہے۔ ہم نے کُچھ بسکٹ سیب وغیرہ منگا رکھے ہیں، سیب کاٹنے کے لئے چاقو مانگا۔ بے چاری کو اور تو کوئی چھری چاقو نہ ملا۔ وہ ٹوکہ لے آئی جس سے بڑ قصاب بھینس اور بیل ذبح کیا کرتے ہیں۔ بلکہ اُس کی ایک ہی ضرب سے گینڈے کی گردن بھی اڑائی جاسکتی ہے۔ خیر سیب بھی جُغادری سائز کا تھا اور مہینہ بھی بقر عید کا۔

یہاں تھرمامیٹر مُنہ میں نہیں لگاتے، ہمیشہ بغل میں لگاتے ہیں۔ ہمارے ہاں بغل میں اِس لئے نہیں لگاتے کہ اُس میں کئی اور چیزیں رکھی ہوتی ہیں۔ مثلاً چھُری کیونکہ مُنہ میں تو تھرمامیٹر اور رام رام بیک وقت آجاتے ہیں۔ پھر شہر میں ڈھنڈورا پٹوانا ہو

تو بچّے کو بغل میں لینا پڑتا ہے سودؔا نے کہا ہے ع

دِل کے ٹکڑوں کو بغل بیچ لئے پھِرتا ہوں

اور یہ شعر بھی شاید سودؔا ہی کا ہے

اُس نے جب زور بہت لیت و لعل میں مارا

ہم نے دِل اپنا اٹھا اپنی بغل میں مارا

بابر دو آدمیوں کو بغلوں میں داب کے شہر کی فصیل پر دوڑا کرتا تھا۔ آج کل بھی بعض ہمّت والوں کو ایسے محبوب بغل میں مارے دیکھا ہے جو تن و توش میں دو آدمیوں کے برابر ہوتے ہیں۔ پچھلے چند سال سے اُردُو میں ایک نئی اصطلاح مُغل بچّہ بھی نِکلی ہے۔ گویا فیملی پلاننگ والوں کے لئے یہ دوسرا راستہ کام کا کھُل گیا ہے۔ اب اُن کا اسٹاف بڑھے گا، ترقّیاں ہوں گی، لوگوں کی بغلوں میں ٹانکے لگائے جایا کریں گئے۔

اس شہر میں جی کو لگانا کیا؟

ہم وطنِ عزیز سے چلے ہیں تو گرمی بھی کم از کم کراچی میں تو تھی۔ الیکشن کی سرگرمی نے اِس گرمی کو دو آتشہ کر دیا تھا۔ لوگ کپڑوں سے باہر ہو رہے تھے۔ لندن پُہنچے تو تیرے آزاد کو پالے سے پالا پڑا۔ ہوائی اڈّے پر اُترے تو ہم بھی اوور کوٹ وغیرہ پہنے لقہ کبوتر بنے ہوئے اور ہمارے دوست بھی جو ہمیں لینے آئے تھے۔ ہم نے پوچھا کیا کوئٹے کی لہر آئی ہوئی ہے؟ بولے یہ کوئٹے کی ہوا نہیں ہے، مقامی سردی ہے۔ اور یہاں کے حساب سے سردی نہیں بہار ہے۔ اُن کے گھر کے سامنے بڑا اچھّا

پارک ہے۔ دیکھا کہ وہاں غُنچے سر اُٹھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ روز دو سوت اور کِھل جاتے تھے۔ اُودے اُودے نیلے نیلے پیلے پیلے پیرہنوں کی جھلک ابھی سے دِکھا رہے تھے۔ کوئی دِن جاتا ہے کہ سوکھی گھاس کے قطعے گُل و گُلزار بن جائیں۔ ہمارے لئے اِس موسم میں لندن آنے کا یہ پہلا موسم ہے۔ کبھی ستمبر میں آئے، کبھی نومبر میں آئے۔ پالا پڑنے اور بہار کے آنے سے پہلے سامان باندھا اور رُخصت ہوئے۔

اب مسئلہ اِس شہر میں جی کو لگانے کا ہے۔ لندن چند دِنوں یا چند ہفتوں کے لیے آنا اور بات ہے۔ ہم خوش خوش آئے اور خوش خوش گئے۔ لیکن لمبے عرصے کے لیے رہنا اور رہنے کے لیے خود کو تیّار کرنا اور آگے کا کم پیچھے کا زیادہ سوچنا مختلف کیفیّت رکھتا ہے۔ چنانچہ ہم اُداس ہو گئے اور اب بھی اُداس ہیں۔ اصل میں ہم یہاں چاہت سے نہیں آئے۔ جس طرح مُلک کی معیشت کو ترقّی دینے کے لیے بہت سی چیزیں دساور کو بھیجی جاتی ہیں۔ ہمیں بھی بر آمد کیا گیا ہے۔ اِس کا ہمارے مُلک کی یا ولایت کی معیشت پر کیا فرق پڑتا ہے، یہ ابھی دیکھنا ہے۔ اتنا ہے کہ انشا پر دازی کی حد تک فی الحال راہِ مضمُون تازہ بند ہے۔ مُلک کے اخبار سامنے نہیں جن سے مضمُون کشید کیا کرتے تھے، جِن کے چراغوں سے ہم اپنے چراغ جلایا کرتے تھے۔ ہم الیکشن کی

مُہم بیچ میں چھوڑ کر آ گئے تھے۔ یہاں ہر کوئی ہمیں الگ لے جا کر پوچھتا تھا کہ کیا ہونے والا ہے۔ کِس کی کتنی سیٹیں آئیں گی۔ کس کے جلسے میں کتنے لوگ آئے تھے۔ خُدا بھلا کرے لندن کا جنگ پاکستان کے بارے میں سبھی خبریں علی صُبح دے دیتا ہے سوائے اِس قسم کی خبروں کے کہ ٹنڈوالہ یار میں طوطا توپ چلاتا ہے۔ یا ملتان میں کسی گدھے کے سر پر سینگ نکل آئے ہیں۔ ہم پوپلے مُنہ سے اِن ہی کا خلاصہ گوشِ گزار کر دیتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہاں کے اُردُو اخباروں کو پاکستان کے بارے میں ہم سے زیادہ معلومات حاصل ہوتی ہیں اور نقطۂ نظر سبھی کا متوازن ہے۔ بس اغوا اور قتل وغیرہ کی خبروں کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ پاکستان ہماری دِلّی ہے اور کراچی ہماری جامع مسجد ہے اور یہ چٹ پٹے مضامین ہمارے لیے جانی کبابی کی مرچوں کی ہنڈیا ہیں۔ میاں محمد حسین آزاد نے ایک صاحب کے قصّے کو نظم کیا ہے۔

آیا دکن سے خلعت دِن راس کے واسطے

اور نقد بہر زادِ سفر اُس کے واسطے

گو ہاتھ سے یہ مال بھی چھوڑا نہ جانا تھا

پر مُنہ بھی اپنا دِلی سے موڑا نہ جاتا تھا

زادِ سفر سنبھال کے چلے تو سہی لیکن مُڑ مڑ کے جامع مسجد کے میناروں کو دیکھتے جاتے تھے۔ جُوں ہی یہ دُھندلے ہوتے ہوئے نظروں سے ناپید ہوئے مسافر اُلٹے قدموں دِلی لوٹ آیا کہ ہم نہیں جاتے۔ اِس مسافر کو سہولت یہ تھی کہ پیدل جارہا تھا۔ جہاز میں بیٹھ کر اُس کی باگیں نہیں موڑی جاسکتی ورنہ کیا عجب ہمارے ساتھ بھی یہی ہوتا۔

ہم پہلے ۱۹۶۱ء میں لندن آئے۔ بڑا اچھاّ زمانہ تھا۔ تین چار پینی میں انڈر گراؤنڈ ٹرین کئی اسٹیشن لے جاتی تھی اور پینی اُس زمانے میں پونڈ کا دو سو چالیسواں حصّہ ہوتی تھی۔ پونڈ میں بیس شلنگ اور شلنگ میں بارہ پینس۔ ۱۹۶۷ء میں بھی حالات بسا غنیمت تھے۔ ہمارا بہت عمدگی سے گزارہ ہوتا تھا جس کا احوال ہماری کتاب آوارہ گرد کی ڈائری میں ہے۔ ۱۹۷۰ء میں کُچھ مہنگائی محسوس ہورہی تھی۔ اور ۱۹۷۱ء میں کُچھ اور زیادہ لیکن ایسی بھی نہیں۔ اب نئ پینی پونڈ میں کل سو ہیں اور یہ غنیمت ہے کہ پونڈ سستا ہو گیا ہے۔ پھر بھی آنے والا مسافر ہر پونڈ کے سترہ روپے گِنتا ہے تو کلیجہ مسوس کر رہ جاتا ہے۔ اب دو تین اسٹیشن بھی جائیں تو بیس پینی پچیس پینی۔ ایک دِن ومبلڈن کے علاقے میں گئے تو پچاس پینی یعنی آدھے پونڈ کا ٹکٹ لیا۔ اِس

سے زیادہ کے بھی ہیں اور خبر یہ ہے کہ اور بڑھے گا۔ یہی شرح مہنگائی کی اور چیزوں کے باب میں بھی ہے۔ ہم نے یہاں کے لوگوں کو پیشکش کی تھی کہ ہمیں کُچھ دِن یہاں کا راج پاٹ سونپ دو اور بَن باس لے کر اِدھر اُدھر نکل جاؤ تو ہم قیمتوں کو ٹھکانے کی سطح پر لا کر دِکھا دیں۔ ہم نے تو بڑی سنجیدگی سے تجویز پیش کی تھی لوگ ہنس کر ٹال گئے کہ واہی ہوئے ہو۔ ہم یہ بتادیں کہ لندن اور انگلستان اب بھی سستے گنے جاتے ہیں۔ یورپ اور امریکہ کے لوگ یہاں خریداری کرنے آتے ہیں۔ گویا وہاں مہنگائی کا احوال اور بھی دیگر ہے۔ جانے اِن مُلکوں میں کس نالائق پارٹی کا راج ہے۔

سردی کا کیا ذکر ہے۔ انگلستان کے آغا حشر یعنی شیکسپئر فرما گئے ہیں۔

چل اے ہوائے زمستاں، چل اور زور سے چل

تو سرد مہریٔ احباب سے زیادہ نہیں

ہمیں تو ابھی سے گرمی کی فکر ہے کیونکہ یہاں کے سارے مکان سردی کے حساب سے بنے ہوئے ہیں۔ کھڑکیاں شیشے کی، وہ بھی بند۔ روشن دان کا رواج نہیں اور پنکھے یہاں نہیں ہوتے۔ لیکن پچھلے سال ایسی کڑاکے کی گرمی پڑی کہ لوگ الاماں

پکار اُٹھے۔ جن کو بازار سے پنکھے دستیاب ہوئے جس بھاؤ بھی مل سکے لے آئے۔ باقی نے اخباروں اور گتّوں سے ہوا جھلی، پانی کا بھی توڑا ہوا، انگلستان کے بعض علاقوں میں تو پانی کا راشن ہو گیا تھا۔ گھروں کے نل کاٹ دیے گئے تھے۔ محلّے میں نل ڈال کر دو بالٹی پانی فی خاندان کی حد مقرّر کر دی گئی۔ بھئی ہم پانی کے جانور ہیں۔ جمعہ کے جمعہ ضرور نہاتے ہیں۔ دیکھئے ہمارا کیا ہوتا ہے۔ ٹیمز میں ڈُبکی لگائیں۔ لیکن ٹیمز یہاں کا دریائے لیاری ہے، خاصا گندہ ہے جو کہ انگریزوں کا اپنا ہے اور بے چاروں کو یہی میسّر ہے۔ اِسی کے آلھے گاتے ہوتے ہیں بعض شاعروں نے تو لمبی لمبی نظمیں لکھی ہیں۔ ہم نے جب تک ٹیمز نہیں دیکھا تھا ان نظموں کی لذّت لیتے تھے لیکن آنکھ دیکھ کر تو مکھّی نہیں نگلی جاتی۔

اربابِ وطن ہمارے اِس کالم کو ہمارے بخیر و خوبی پردیس پہنچنے کی رسید تصوّر کریں ہم اُمّید کرتے ہیں کہ ہماری غیر موجودگی کے باعث ہمارا معاشرہ ساری برائیوں سے پاک ہو جائے گا۔ اخوّت کا دور دورہ ہو گا۔ لوگ اپنی زندگی اسلام کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کریں گے۔ ویسے جب تک ہم وہاں تھے۔ لوگوں کی کوشش یہ رہی کہ اسلام کو اپنی زندگی کے سانچے میں ڈھالیں، چونکہ یہ سانچہ ذرا چھوٹا پڑتا ہے اِس لیے بہت سا اسلام اِدھر اُدھر بہہ جاتا تھا بلکہ کام کا حصّہ تو عموماً باہر ہی میں رہ

جاتا تھا۔ اب ایسا نہ ہونا چاہیے۔

شجرے کی تلاش میں

"روٹس" کا نام اور ذکر یقیناً پاکستان پہنچ گیا ہو گا۔ روٹس "Roots" یعنی جڑیں۔ پہلے یہ کتاب تھی۔ ایک سیاہ فام امریکی مصنّف ایلکس ہیلی کی تصنیفِ لطیف۔ جب یہ لاکھوں بِک چکی تو اِس پر ٹیلیویژن سیریز بنی جس کی چھ قسطوں میں سے تین گزشتہ ہفتہ بی بی سی ٹیلیویژن پر دِکھائی گئیں۔ جدِھر جایئے اِنہی کا چرچا ہے۔ امریکی میں ٹیلیویژن کا مقبول ترین سیریز گنا گیا ہے جسے ۳۷ فیصدی امریکیوں نے دیکھا۔ ہمارے حساب سے دیکھا جائے تو یہ کچھ بھی نہیں ہے۔ ہمارے ٹیلیویژن پر ایک

پروگرام ہوتا تھا آپ کی رائے۔ ایسا ہی کُچھ عنوان جس میں بتایا جاتا تھا کہ پروگرام کو اتنے فیصدی نے پسند کیا، اتنے فیصدی نے ناپسند کیا ہے۔ ہمیں یاد پڑتا ہے بعض پروگراموں کے متعلّق یہ بتایا جاتا تھا کہ اِن کو ۸۲ یا ۹۲ فیصدی نے دیکھا اور پسند کیا۔ اور فرمائش کی ہے کہ ایک بار دیکھا ہے، دوسری بار دیکھنے کی ہوس ہے وغیرہ۔ لُطف کی بات یہ ہے کہ خود اِس پروگرام ''آپ کی رائے'' کے بارے میں معلوم ہوا ہے کہ اِسے نوّے، پچانوے فیصد لوگ دیکھتے ہیں۔ بلکہ پسند کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں میں چیز کو پسند کیا جاتا ہے بہت پسند کیا جاتا ہے اور جسے ناپسند کیا جاتا ہے اُسے بہت ناپسند کیا جاتا ہے۔ ایک پروگرام کو تو جس کا نام ہم اِس وقت بھول رہے ہیں کوئی ۱۳۵ فیصدی ناظرین نے دیکھا اور اِن میں سے ۱۳۴ فیصدی نے پسند کیا۔ صرف ایک فیصدی نے کہا کہ اچھّا نہیں ہے۔ امریکی وغیرہ اِس معاملے میں ابھی پھسڈّی ہیں۔

امریکی ایک اور معاملے میں بھی ہم سے پھسڈّی ہیں۔ اُن میں سے بہت سے ایسے ہیں کہ اچھّا کھاتے پیتے ہیں۔ کاریں تک دوڑاتے پھِرتے ہیں خواہ وہ قسطوں پر ہی کیوں نہ خریدی ہوں۔ لیکن ماضی یعنی شاندار ماضی اُن کے پاس نہیں ہے۔ روٹس کی بے پناہ مقبولیت کی وجہ یہی ہے کہ اِس کے مصنّف نے جھوٹی سچّی تحقیق کر کے یہ

ثابت کیا ہے کہ میں آسمان سے نہیں گرا۔ میرے بھی اجداد تھے۔ میرا بھی ماضی ہے۔ اور وہ یوں کہ میرے ایک پُرکھے کنٹا کنٹے نامی گیمبیا سے آئے تھے۔ ہوا یہ کہ ایک روز جنگل میں لکڑی کاٹنے گئے، اُن کو غُلاموں کی تجارت کرنے والے سفید فاموں نے گھیر لیا اور ڈنڈا ڈولی کر کے جہاز پر لاد کر امریکہ پہنچا دیا۔ ناول اور فلم میں دِکھایا گیا ہے کہ غُلام بنانے والوں نے راستے میں اُن کی سرکوبی اور گوشمالی کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیا اور جو کسر رہ گئی تھی وہ امریکہ آکر غُلاموں کی خریداری کرنے والوں نے پوری کر دی۔ پوری فلم میں تڑاتڑ چانٹے برستے ہیں۔ ہم تو ٹیلیویژن سے دُور بیٹھے ہیں کہ کہیں ایک آدھ ہمیں بھی نہ پڑ جائے۔ شروع کی ایک دو قِسطوں میں معمولی سا عشق بھی دِکھایا ہے کہ اِس کے بغیر ناول یا فلم کی گاڑی نہیں چلتی۔ تیسری قِسط میں ہیرو صاحب یعنی کنٹا کنٹے نے اِس معاملے میں بڑھ چڑھ کر ہاتھ مارے حتّٰی کہ صاحبِ اولاد ہو گیا۔ اِن کو صاحبِ اولاد ہوتا نہ دِکھاتے تو جناب مصنّف کی ولدیت اور شجرے کا مسئلہ کیسے حل ہوتا۔ سارا معاملہ اچھّا خاصا چل رہا تھا کہ سنڈے ٹائمز کے ایک مضمون نگار مارک اوٹاوے نے بھانجی مار دی۔ یہ گیمبیا گئے۔ جس گاؤں میں بھی گئے جس کا ذکر ناول نگار نے کیا ہے اور جو اب امریکی سیاہ فاموں کی زیارت گاہ بن گیا ہے، اور تحقیق کے موتی رول کے لائے کہ یہ سارا

قصّہ پار و ہوا ہے۔ اوّل تو کنٹا کنٹے نام کا کوئی آدمی تھا ہی نہیں تھا۔ تو وہ غُلام کے طور پر پکڑا نہیں گیا اور پکڑا گیا تو وہ جناب مصنّف کا جدِّ امجد نہیں ہو سکتا تھا۔ وغیرہ وغیرہ۔ مصنّف جو آج کل لندن آئے ہوئے ہیں اِن صاحب پر بہت آگ بگولا ہیں کہ دیکھو اتنی مُشکل سے ہم نے شجرہ بنایا اور یہ شخص اِسے غارت کیے دے رہا ہے۔

اوٹاوے صاحب کے مضمون سے معلوم ہوا کہ ہمارے مُلک کی طرح افریقہ میں بھی بھاٹ قسم کے لوگ پائے جاتے ہیں جو لوگوں کے شجرے یاد کرتے ہیں اور شادی بیاہ پر سُناتے ہیں اور مُنہ مانگا انعام پاتے ہیں۔ تھوڑا بہت خرچ کیا جائے تو یہ شجرہ بنا بھی دیتے ہیں یا اِس میں کوئی راجا نوّاب داخل کر دیتے ہیں۔ سو اُس گاؤں کے ایک بھاٹ نے یہ سُن کر کہ ایک امریکی اپنے اجداد اور شجرے کی تلاش میں آ رہا ہے۔ فوراً ایک سِلسِلہ گھڑا اور سُنا دیا۔ ہیلی صاحب یعنی جناب مصنّف خوش خوش لوٹے۔ بعد میں لوگوں نے بتایا کہ یہ بھاٹ صاحب خود سِکّہ بند بھاٹ نہیں ہیں۔ اِن کے باپ پادری تھے لیکن چونکہ یہ نالائق تھے اور عورتوں کے پیچھے بہت گھومتے تھے جو ہر مُلک میں نالائق کی نشانی شُمار کی جاتی ہے اِس لیے باپ نے محبّت نامے سُنانے کا ہنر اِن کو ورثے میں نہیں دیا، حتّٰی کہ گرجے کی پادراہٹ تک نہیں دی۔ بعد میں ہیلی صاحب نے بھی مانا کہ ہاں وہ شخص ایسا ہی سُنا ہے۔ غچّہ دے گیا لیکن

تفصیلات سے قطع نظر بات اپنی جگہ درست ہے۔ میں نے پرانے ریکارڈ بھی چھان مارے ہیں۔ یہاں بھی اوٹاوے صاحب اور ہیلی صاحب میں بہت اختلاف ہے۔ اوٹاوے صاحب کے مضمون سے تو یہ خیال ہوتا ہے کہ ہیلی صاحب آسمان سے گرے۔ اِن کے آباؤاجداد تھے ہی نہیں۔ یہ ذرا زیادتی ہے۔ کنٹا کنٹے نہ سہی کوئی تو اِن کا جدِّ امجد ضرور رہا ہو گا۔ اور چونکہ یہ کالے ہیں، وہ بھی کالا ہی ہو گا۔ ہماری بات کوئی مانے گا نہیں ورنہ ہم پیشگی کرتے کہ بھئی اچھّا ہمیں اپنی بزرگ مان لو۔ جدِّ امجد گردان لو۔

گر نازنین کہے سے بُرا مانتے ہیں آپ

میری طرف تو دیکھئے میں نازنیں سہی

ایلکس ہیلی صاحب نے غَلَطی کی کہ اپنے شجرے کے لیے افریقہ کے مُلک گیمبیا کا رُخ کیا اور مورثِ اعلیٰ بھی بنایا تو ایک معمولی حیثیت کے غُلام کو بنایا۔ وہ ہمارے ہاں آتے تو جتنے پیسے اُن کے خرچ ہوئے اِس میں آدھے میں ہم اِن کا شاندار شجرہ بنوا دیتے۔ وہ سیّد، مُغل، افغان وغیرہ جو کچھ بننا چاہتے اُس کا تحریری اور تاریخی ثبوت مہیّا کرتے۔ کوئی مخطوطہ ڈھونڈ ڈالتے جس سے معلوم ہوتا کہ اِن کے بزرگ

خراسان یا تُرکستان سے دبڑ ربڑ کرتے یہاں آتے تھے اور آتے ہی عہدہ بست ہزاری کا اور ٹونڈلہ کی جاگیر پائی تھی۔ مُغل افغان وغیرہ نہ بنتے تو اِن کو ہم اگنی کل راجپوت تو بنوا ہی دیتے۔ کسی کا قولِ متعیّن ہے۔ غلّہ چوں ارزاں شود امسال سید می شوم۔ امریکہ میں خوش حالی کی نہیں، ایلکس ہیلی صاحب نجیب الطرفین سیّد بن کر اور سابقے لاحقے لگا کہ یہاں سے جاتے۔ سنڈے ٹائمز کا نامہ نگار بھی اُن کا کچھ نہ بگاڑ سکتا تھا۔ آخر ہمارے ہاں یہ کاروبار ہوتا ہی ہے۔

عجیب بات ہے کہ امریکنوں کے پاس خواہ وہ سیاہ فام ہی کیوں نہ ہوں، حال بھی ہے اور مستقبل بھی ہے۔ وہ ماضی کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ ہمارے پاس اتنا ماضی ہے کہ سنبھالے نہیں سنبھلتا بلکہ اس پر شجاعت کا لیپ کرنے کے لیے مکرمی نسیم حجازی وغیرہ بھی موجود ہیں۔ حال البتّہ قدرے خراب ہے۔ یہ ہم گرائمر کی اصطلاح میں زمانہ حال کا ذکر کر رہے ہیں۔ اب رہا مُستقبل سو اُس کی خبر نہیں ہے۔ سچ یہ ہے کہ آناں را کہ ایں دہند آں نا دہند، ہماری رائے میں تو مسئلے کا یہ حل زیادہ مناسب ہو گا کہ امریکہ والے اپنے مال ہی سے کُچھ موٹریں، فریج، ٹیلی ویژن اور ڈالر وغیرہ ہمارے حوالے کریں اور ہمارے شاندار ماضی میں سے جو چاہیں اُن کی نذر ہے۔ صاحبِ دیوان دادا پَر دادا، ہفت ہزاری اور بست ہزاری نانا پر نانا، خراسان

مشہد،ماوراالنہر،بابر، تیمور،خانِ خاناں، شجرے سے شجرے۔

ہزار ہا شجرہ دار سایہ دار راہ میں ہے۔

ہماری صحت کا کُچھ کُچھ اثر ہو رہا ہے

یوں تو لندن میں پہلے بھی کوئی چیز اصل قیمت پر نہ ملتی تھی۔ دوکاندار صاف کہہ دیتا تھا کہ حضرت اصل قیمت سے کم پر لینی ہے تو لیجئے ورنہ کوئی اور دُکان دیکھیے۔ ہر چیز پر دو قیمتوں کی پرچی لگی رہتی تھی۔ ایک اصل قیمت یا کارخانے کی قیمت۔ دوسری دُکان ہذا کی رعایتی قیمتِ فروخت بلکہ بالعموم تو دُکاندار کو خود پرچی لگانی نہیں پڑتی۔ کارخانے والا پیکٹ پر ہی چھاپ دیتا ہے کہ اِس صابن میں پانچ پینس رعایت ہے، اِس ٹوتھ پیسٹ میں تین پنس کی کمی۔ لیکن آج بھی تو اِس شہر میں سیل کی گنگا بہہ

رہی ہے، اور اِس گنگا میں ہاتھ دھونے اور نہانے کے لیے پوری دُنیا کے سیّاح پُہنچے ہوئے ہیں۔ آکسفورڈ اسٹریٹ پر جسے دُنیا کا سب سے بڑا شاپنگ سنٹر کہا جاتا ہے، کھوّے سے کھوّا چھلنے کی بات نہیں، ہجوم میں تھالی پھینکئے تو سر ہی سر جائے۔

دوکانداری میں ہمیشہ ایمانداری نہیں چلتی بلکہ ہمارے ہاں کے دُکانداروں کا قولِ متین تو یہ ہے کہ بالکل نہیں چلتی۔ یہاں بھی قیمتوں کا حساب یہ ہے کہ اکثر مصنُوعی طور پر بڑھاتے ہیں اور پھر گھٹانے میں یعنی خریدار کو رعایت کا لاسہ لگاتے ہیں۔ دس روپے کی چیز پر پندرہ روپے لکھے، پھر اُسے کاٹ کر دس کر دیا۔ بُدھو خریدار خوش خوش گھر گیا۔ رعایتی قیمتوں کے علاوہ کُچھ اور نسخے بھی ہیں۔ ایک مشہور اسٹور ہے آر گوس۔ اِس کے یہاں سے ہم نے ایک روز کُچھ چیزیں خریدیں کوئی بارہ چودہ پونڈ کی۔ اُس نے ایک پونڈ کا واؤچر تھما دیا کہ اگلی بار آپ یہاں سے کُچھ بھی خریدیں بشر طیکہ مالیت دس پونڈ سے زیادہ ہو تو آپ کو ایک پونڈ کی رعایت ملے گی۔ چند دِن بعد ہم نے وہاں سے چودہ پونڈ کی اور چیزیں بھی خریدیں، وہ بھی ایک پونڈ کی رعایت کے لالچ میں ورنہ ضرورت نہ تھی اور اگر تھی بھی تو پانچ سات پونڈ کی چیزوں کی تھی۔ خیر دُکاندار نے اُس میں ایک پونڈ کم کیا اور ایک پونڈ کا واؤچر مزید تھما دیا کہ بچّو پھر بھاگے بھاگے آؤ گے۔ لیکن ہم کوئی بے وقوف ہیں؟ اتنا ضرور ہے کہ اُس

واؤچر کو پھینکنے کی ہمّت بھی نہیں پڑتی کہ ایک پونڈ کے نوٹ کے برابر ہے۔ دیکھئے آخر میں دُکاندار جیتتا ہے یا ہم۔

لندن کی آکسفورڈ اسٹریٹ کو دُنیا بھر کا سب سے بڑا شاپنگ سنٹر کہا جاتا ہے۔ یہاں کے بڑے مشہور اسٹور اِس چار فرلانگ لمبی سڑک پر پھیلے ہوتے ہیں جو ماربل آرچ سے چل کہ ناٹم کورٹ روڈ کے چوراہے پر ختم ہوتی ہے۔ بے شک خریداری کے اور بھی بڑے مرکز ہیں۔ نائٹس برِج کے علاقے ہیں اور یہاں کی انارکلی یا ایلفی یعنی پکاڈلی میں لیکن آکسفورڈ اسٹریٹ کی بات اور ہے۔ دُنیا بھر کے لوگ جیب میں پونڈ اور ہاتھوں میں مختلف دُکانوں کے ناموں کے تھیلے لیے بولائے بولائے پِھرتے ہیں۔ اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے۔ جہاں دُنیا بھر کے سیّاح آئے اُن کے ساتھ اِن کی خدمت کے لئے اُچکّوں اور جیب کُتروں کے بین الاقوامی گروہ بھی آئے۔ اٹلی سے، لاطینی امریکہ سے، اور نہ جانے کہاں کہاں سے۔ اسٹوروں پر بار بار اعلان ہوتے ہیں کہ صاحبو ہوشیار۔ جیب پاکٹ سے خبردار لیکن لوگ ڈال ڈال، یہ پات پات۔ ہائے بھائی آج کل یہاں ہیں۔ کل ایک لِفٹ سے برآمد ہوئے تو معلوم ہوا کہ خالی برآمد ہوئے ہیں۔ اُن کے پچاس پونڈ پیچھے لِفٹ میں ہی رہ گئے، مع اُن کو نکالنے والے کے۔ یہاں ہمیں جیب کُترے کا نقطۂ نظر بھی دیکھنا پڑتا ہے۔ بے چارہ اِتنی دُور سے

آس لگا کر رہتا ہے اور اپنے کسب کے زور سے کماتا ہے۔ ع

جس طرح کا بھی کسی میں ہو کمال اچھّا ہے

یوں تو لندن میں اب لندن والا رہ کون گیا ہے۔ لیکن آج کل کے سیّاحوں کی یورش کا زمانہ ہے۔ انگریز بالکل ہی نظر نہیں آتا۔ ہم جس علاقے میں رہتے ہیں اُس میں عربوں کی اتنی ریل پیل ہے کہ ہمارا ایمان ہر وقت تازہ رہتا ہے، اور اگر کوئی انگریز اِدھر سے گزرے تو لوگ ٹھِٹھک کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ بسوں میں اور سڑکوں پر آپ کو بھانت بھانت کے لباس نظر آئیں گے اور بھانت بھانت کی بولیاں کان میں پڑیں گی۔ یہاں کے عرب لباس میں زیادہ تکلّف نہیں کرتے، بہت سے اپنی عبا قبا میں نکلتے ہیں۔ اور بڑے بڑے عمامے باندھ کر۔ اِسی طرح عورتیں بھی اپنی سج دھج نرالی رکھتی ہیں۔ یہاں کا انگریز ایشیائی سے تو بغض دِکھاتا ہے لیکن عرب کو اہلاً و سہلاً کہہ کر بُلاتا ہے کہ سونے کی چڑیا ہے۔ ابھی بٹوا کھول کر نہال کر دے گا۔ مالا مال کر دے گا۔

کام تو ہمیں یہاں اور بھی تھے اور ہیں لیکن ایسا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ اپنے مُلک کی پسماندگی اور یورپ کی ترقّی کے درمیان فرق دُور کیا جائے۔ اِس کی ایک صورت تو

یہ ہے کہ اپنے مُلک کو فروغ دے کر اِن کے دوش بدوش لایا جائے لیکن یہ ٹیڑھا معاملہ ہے اور دقّت اور محنت چاہتا ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ ترقّی یافتہ مُلکوں کی لگام کھینچ کر انہیں اپنی سطح پر لائیں۔ الحمدِلِلہ ہمیں اِس میں لندن کی حد تک خاصی کامیابی ہوئی ہے۔ ہماری صحت کا کُچھ اثر ہو رہا ہے۔ اب آپ کو یہاں سڑکوں پر بہت جگہ کوڑا نظر آئے گا۔ بے شک جا بجا نوٹس لگا ہے کہ کوڑا پھینکنے کی سزا سو پونڈ لیکن کسی کو کون پکڑے۔ یہاں کی پولیس اپنی دیانت اور خدمت کے لئے مشہور تھی۔ ہماری سطح پر اب نہیں پہنچی۔ لیکن ایسی مثالیں اخبار میں آتی رہتی ہیں کہ پیسے لے لیے اور مجرم سے درگزر کیا۔ جس طرح ہمارے ہاں تھانے والے کوکین اور چرس فروشوں اور اسمگلروں کی سرپرستی کا حق ادا کرتے ہیں۔ یہاں بھی بعضوں کو رشوت کی چاٹ پڑ گئی اور وہ فحاشی کے اڈّے چلانے والوں سے اپنی چوتھ وصول کرتے ہیں۔ ایک روز اخبار میں کارٹون دیکھا کہ ایک راہ گیر نے کانسٹیبل سے وقت پوچھا۔ اُس نے وقت تو بتا دیا کہ سوا پانچ بج رہے ہیں لیکن ہاتھ بھی پھیلا دیا کہ جاتے ہو کِس طرف کو کِدھر کا خیال ہے؟ وقت بتانے کی زحمت کے دس پنس ہوئے دیتے جاؤ۔ کل ایک بس میں بس کنڈکٹر نے ہم سے پیسے تو لے لیے لیکن ٹکٹ نہ دیا۔ بس مُنہ اُدھر کو کر لیا۔ بہت خُوشی ہوئی۔ وطن سے دوری کا احساس جاتا رہا۔ انصاف سے

کہہ دیں کہ وہ کنڈکٹر انگریز نہ تھا۔ کالا آدمی تھا۔

ہم نے بھی آہ آہ نہ کی، ہم بھی چُپ رہے

اور بھی خبریں ہیں جِن سے ڈھارس بندھتی ہے۔ مثلاً ہماری ڈاک سے اخبار ہو جاتا ہے اور ایک روز خبر لگی کہ ایک خط گھر سے چلا اور چالیس برس میں منزل پر پہنچا۔ ہمسٹڈ کے ایک صاحب نے ہمسٹڈ کے چیف لائبریرین کے نام بھیجا تھا کہ جناب آپ کی لائبریری میں بعض کتابیں ایسی ہیں جن سے پڑھنے والوں کا اخلاق خراب ہونے کا اندیشہ ہے اور اخلاق خراب ہوا تو ہم آنے والی جنگ کیسے جیت سکیں گے جو ہو گی ضرور۔ پھر اخبار والوں نے خبر چھاپی کہ شہر کی ایک مشہور سڑک پر اتنا بڑا گڑھا کھُدا ہے جِسے کسی نے پُر نہیں کیا، ویسے ہی چھوڑ گئے ہیں اور آنے جانے والوں کے لیے خطرے کا باعث ہے۔ یہاں کی کارپوریشن کے تعلّقات عامہ نے جیسا کہ اُن کا فرض تھا فوراً تردید شائع کی۔ ع

کہ جو پوچھو حقیقت تو ہے یہ حقیقت،

کہ اِس بات کی، کچھ حقیقت نہیں ہے

لیکن جب اخبار والے نے تصویر چھاپ دی تو آدمی بھیج کر اُسے پُر بھی کرا دیا۔ ہم اُمّید کرتے ہیں کہ ہماری کوششیں بار آور ہوئیں تو یہاں لوگ خوراک میں ملاوٹ بھی کرنے لگیں گے کیونکہ اِس وقت ہمیں لندن میں یہی تکلیف ہے کہ کوئی چینی نا خالص نہیں ملتی۔ دودھ خالص، دہی خالص، مکھّن، آٹا، مِرچ مسالے خالص، شہد تک خالص۔ ہمیں چینی الگ سے خریدنی پڑتی ہے۔ یہی چیزیں ہمارے حلق سے نہیں اُترتیں۔ کوئی صاحب وطن سے تشریف لائیں تو ہمارے لیے ملاوٹ کے تحفے لائیں۔

نامۂ شوق۔۔۔۔۔

ہمارا ایک شعر ہے بھلے وقتوں کا۔

منّتِ قاصد کون اُٹھائے شکوۂ درباں کون کرے

نامۂ شوق غزل کی صورت چھپنے کو دو اخبار کے بیچ

اپنے قارئین کی حضوری سے دوری کے چار دِن بھی بہت ہوتے ہیں اور یہ تو دو ڈھائی مہینے کی بات ہے۔ یہ ہم اپنے احساس کی بات کر رہے ہیں۔ اِن قارئین کی نہیں

جنہوں نے سُکھ کا سانس لیا ہو گا۔ اپنے اعصاب کی چمپی کرائی ہو گی۔ ثِقہ مسائل پر ثِقہ تحریروں کا تھو تھا مُنہ بنا کر لُطف اٹھایا ہو گا۔ دُور کیوں جائیں۔ ہمارے عزیز دوست جمیل الدّین عالیؔ نے کب ہمیں معتبر جانا، ہمارے کالم کو اپنے الفاظ میں بفونری ہی گردانا جس کا ترجمہ کسی طرف سے بھی کیجئے ہماری طبیعت کو مرغوب نہ ہو گا۔ عالی صاحب تو خیر محبّت سے کہتے ہوں گے۔ بنگال کے ادیب پرنسپل ابراہیم خاں نے اپنی ایک کتاب میں ہماری بہت جائز ناجائز تعریف کرنے کے بعد لکھا ہے کہ اُن کو جدید اُردُو ادب کا مُلّا دو پیازہ کہا جا سکتا ہے۔ یہ زرّیں رائے انہوں نے ہماری تحریریں پڑھے بغیر اور ہماری فرمائش کے بغیر عطا کی۔ کہیں پڑھ کر کُچھ فرماتے تو شاید کوئی اور اونچا مقام دیتے۔ ہم کسرِ نفسی نہ کریں تو حق یہ ہے کہ ہم پرنسپل صاحب کی تعریف اور اِس خطاب کے سزاوار ہیں۔ ہمارے سفر نامے "چلتے ہو تو چین کو چلئے" میں جن خان صاحب کا بار بار ذکر آتا ہے۔ جِن کی بھوک کمزور ہو گئی تھی، وہ موصوف ہی تو ہیں:

بیٹھا ہے وہ جو سایۂ دیوار میں

فرمانروائے کشورِ ہندوستان ہے

لیجئے ہماری بات کِدھر سے کِدھر کو چلی گئی۔ کہنا یہ تھا اور مُنہ طرف قارئین کے اپنے تھا۔

بعد مُدّت کے گلے ملتے ہوئے رُکتا ہے دِل

اب مناسب ہے یہی، کُچھ میں بڑھوں کُچھ تو بڑھے

سوال بھر وہی۔ اب کہیئے تو کیا کہیئے، اب لکھیئے تو کیا لکھیئے۔ غالب ؔ ہم نہیں ہیں کہ صاحب کے کفِ دست پر چکنی ڈلی دیکھی اور اُس پر پھسل کر قصیدہ لکھ دیا۔ یہاں تو اُن کے عزیز در عزیز کوئی ذرا سی بات کہنے کے لیے مشاہیر یونان و روما کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ جب تک اپنی بات سولن کے مُنہ میں ڈال کر نہ کریں لوگ نہیں سُنتے۔ اِس سے ہمیں ذاتی طور پر بہت فائدہ پہنچا۔ اب تک ہم سولن کو شملے کے قریب ایک پہاڑی تحصیل کا صدر مقام سمجھا کرتے تھے۔ سولن، سپاٹو وغیرہ۔ اب معلوم ہوا کہ اِس نام کا کوئی آدمی بھی تھا اور شہر بھی تھا اور بد تمیز بھی تھا۔ قارون جیسے بادشاہ سے ٹیڑھی بانی کرتا تھا۔ آج کوئی امریکہ کے صدر سے ایسی باتیں کر کے دیکھے تو خود غالب ؔ مرحوم سمجھدار آدمی تھے۔ شاعری میں کہیں پچڑ مار جاتے تھے کیونکہ شاعری انگریزوں کی سمجھ میں کم ہی آتی تھی اور ذاتی خطوط میں دِل کا غُبار نکال لیتے

تھے کیونکہ علاقے کا تھانے دار اِن دِنوں خط سنسر نہیں کیا کرتا تھا۔ اپنی سنجیدہ نظم و نثر میں جسے وہ رجسٹری کر کے اور پھول پتّیاں بنوا کر صاحبانِ عالی شان کو بھیجتے بھجواتے تھے۔ آپ انہیں کہیں راہِ ثبات اور احتیاط سے بھٹکتا نہ پائیں گے۔ ہم عرض کریں گے کہ عالی صاحب ہمیں سولن اور دیو جانسن کلبی اور لمبے لمبے ناموں والے روسیوں یونانیوں کے نام لے کر بھٹکانے کی کوشش کریں۔ ہم تو قارون کے سامنے آتے تو سیدھی خُدا لگتی سچّی کھری بات کہتے کہ بابا تُجھ سے زیادہ شادمان اور بامُراد اور خوش قسمت اور ذہین اور خوش شکل بلکہ شاعر نغز گُو و خُوش گُفتار بھی کوئی ہو سکتا ہے؟ جو کہے کہ ہو سکتا ہے ذرا اُسے ڈنڈا ڈولی کر کے ہمارے سامنے لا۔ اور ہاں اک ذرا ہمارا خیال رکھنا۔

تُو سلامت رہے ہزار برس

ہر برس کے ہوں دِن پچاس ہزار

یہاں انگریزوں کے ہاں مَلِکۂ مُعظّمہ کی سِلور جوبلی ہوئی۔ بہت رونق رہی۔ آپ سب نے ریڈیو اور اخباروں میں اُس کی جھلک دیکھ لی۔ دیکھئے ایک بے اختیار کا اعزاز انگریز بھی خوب ہے۔ ایک طرف میگنا کارٹا پر دستخط کراتا ہے اور پھر ہر صدی بعد

شاہ کے قدموں کے تلے سے اختیارات کا قالین کھِسکا تا ہے۔ اور اُوپر سے کیا کیا روایات کی پھول پتّیاں بناتا ہے۔ سچ یہ ہے کہ ہمیں تو یہ روایت پسند آئی حالانکہ مخالفت کرنے والے ناہنجار بھی تھے اور نیوا سٹیٹسمن نے تو اینٹی جوبلی نمبر نکالا اور یہ پوچھا کہ لوگو اتنے پیسے کیوں؟ اتنی سی بات پر سلفہ کیے دے رہے ہو۔ خیر یہ انگریزوں کا داخلی معاملہ ہے۔ ہمیں اپنی جگہ پر افسوس ہوا کہ ہمارے ہاں سے بادشاہ ختم ہو گئی۔ ورنہ ہم بھی جوبلی منا کر اپنا جی خوش کرتے۔ بھلے دنوں میں پھر اچھا تھا۔ ملکہ وکٹوریہ انگریزوں کی بھی مَلِکہ تھیں۔ ہماری بھی مَلِکہ تھیں۔ ہم نے بڑی دھوم دھام سے جوبلی منائی۔ ہائے نوّابوں راجواڑوں نے تو بڑھ چڑھ کر نذریں دیں اور جلوس نکالے۔ شہنشاہ جارج پنجم کی جوبلی ہم نے بھی دیکھی۔ چوتھی جماعت پاس کی تھی لیکن اسکاؤٹ کی وردی زیبِ تن کر کے لاٹھی لے کر دو ہزار لڑکوں کی قطار میں کھڑے تھے۔ تو سمجھتے تھے کہ سب کی نظریں ہمیں پر ہیں ویسے یہ جوبلی وکٹوریہ کی جوبلی کے مُقابلے کی نہ تھی جس کے لئے ہمارے مولانا حالیؔ تک نے صدقِ دِل سے دُعا کی تھی۔

قیصر کے گھرانے پہ رہے سایۂ یزداں

اور ہند کی نسلوں پر رہے سایۂ قیصر

ہم خواہ مخواہ کتنی بار گُستاخی کر جاتے ہیں ورنہ شاعر لوگ معصوم ہوتے ہیں۔ جب غالبؔ نے دُعا مانگی تھی تو تھوڑا ہی ہے کہ اُن کو بہادر شاہ کی عُمر اور صحت کا حال معلوم نہ تھا۔ یا یہ پتہ نہ تھا کہ پچاس ہزار دِن کتنے ہوتے ہیں جو اُن کے خیال میں ہر برس میں ہونے چاہئیں تھے۔ یعنی شعری اور معاشی ضروری بھی تو ہوتی ہیں۔ اور ہم نے حالیؔ کا شعر دیا ہے۔ وہ بھی کسی بُری نیّت سے نہیں دیا بلکہ ہم تو اِسے دوبارہ پڑھ کر اُن کی دور بینی اور بصیرت بلکہ ولایت کے قائل ہو گئے۔ ہم تو کسی طور بچ کے نکل آئے۔ ہند کی نسلوں پر ابھی تک سایۂ قیصر ہے۔ مُراد جی ڈیسائی نے کوئٹ انڈیا موومنٹ میں بھی اچھّا خاصا حصّہ لیا تھا اور کامن ویلتھ کانفرنس میں بھی پدھارے تھے۔ اگر پاکستان علیحدہ نہ ہوا ہوتا تو تھوڑا سا سایہ پاکستان کی نسلوں پر بھی ہوتا۔ حالیؔ اِس معاملے میں قوم پرست اور ہوشیار نکلے کہ انہوں نے مُدّت کی تخصیص نہیں کی، ویسے ہمیں خیال سے بحر میں وزن کی تھوڑی سی گنجائش ہوتی تو "تا قیامت" کے الفاظ بھی لے آتے۔ بادشاہت کا فائدہ انگریزوں کو یہ تھا کہ اُن کی معاشی حالت ٹھیک ہو گئی۔ اُن کو ہر سال خسارے کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ جوبلی کے باعث سیّاحوں کی ریل پیل اِس سے بچا کے لے گئی۔ جسے دیکھو یونین جیک کا جانگیا پہنے یونین جیک کی چھتری لگائے گھوم رہا ہے۔ پُرانی حکایت ہے کہ بنئے کا بیٹا گرتا

ہے تو کُچھ دیکھ کر گِر گر تا ہے۔ بہادر شاہ ظفر کا کوئی وارث سُنا ہے اب بھی کہیں ماڈل ٹاؤن کے کسی کونے میں رہتا ہے۔ یارو اُسے جھاڑ پونچھ کے لاؤ۔ اُس کے سر پر چتر سجاؤ۔ پچیس برس انتظار کی حاجت نہیں۔ ابھی سے اُس کی جوبلی مناؤ اور زرِّ مبادلہ کماؤ۔ ہم جوبلی مناتے بھی ہیں تو حفیظ جالندھری کی لیکن بھائی اِس سے بات نہیں بنی۔

اب کے جوبلی کے موقع پر خطابات کی فہرست بھی شائع ہوئی۔ بہت سے لوگ بیٹھے بٹھائے لارڈ یعنی راجے نوّاب بن گئے۔ اور نائٹ یعنی سر تو اتنے کہ اخبار کے صفحے پر سر ہی سر نظر آتے تھے۔ ہمارے مُلک میں بھی لوگ سر بنا کرتے تھے لیکن بڑی کھکھیڑوں اور سفارشوں اور مدّتوں کے بعد۔ اور قوم پرستوں کے طعنے الگ۔ یہاں کی پوری فہرست تو ہم سے پڑھی نہ گئی تاہم اِس پر ہمارے ہم پیشگاں لکھنے لکھانے والوں کے نام بھی نظر آنے۔ حتّٰی کہ کامیڈین اور کھیل تماشا دِکھانے والوں کے بھی جن کا نام اربابِ نشاط کی فہرست میں ہوا کرتا ہے۔ اِس سے نیچے خطابات کا تو شمار ہی نہیں۔ ہائے کیا دِن تھے جب ہمارے ہاں بھی سال کے سال خان بہادروں اور خان صاحبوں کی کھیپ تیّار ہوا کرتی تھی۔ لوگ مونچھوں کو وسمہ لگا کر، سر پر طُرّہ، ہار گلے میں، اِترائے اِترائے پھِرا کرتے تھے۔ اہلِ علم کی تین کما حقہ قدر کا

انتظام تھا۔ جس بزرگ کے متعلّق رپورٹ آتی تھی اُس کی عزّت بہت ہوتی ہے اور زندگی تھوڑی رہ گئی ہے۔ اسے شمس العلما بنا دیتے تھے۔ چلیے ہم یہ اصرار نہیں کرتے کہ بادشاہت واپس لائی جائے لیکن خطابات واپس لانے میں کیا ہرج ہے۔ مُفت میں کسی کا جی خُوش ہو جائے تو کیا بات ہے۔ ستارۂ پاکستان کے بارے میں ہم کُچھ نہیں کہتے لیکن شمس العلما ہمیں اچھّا لگتا ہے۔ جب کوئی ہمارا ریٹائرڈ اُستاد ٹوکری لیے کمر پر ہاتھ رکھے چھڑی ٹیکتا نکلا کرے گا تو لوگ احترام کے مارے اپنی موٹریں روک کر کہا کریں گے کہ دیکھو وہ شمس العلما یعنی علم کا سورج جا رہا ہے۔ سبزی لینے نکلا ہے۔ قریب مت جانا۔ عِلم کی زیادتی سے جھُلس جاؤ گے۔

آؤ حُسنِ یار کی باتیں کریں

آؤ حسنِ یار کی باتیں کریں۔ لیکن سیاست کی طرح حُسنِ یار بھی قباحت سے خالی نہیں۔ آج کل حُسن میں بھی دایاں بازو اور بایاں بازو دیکھا جاتا ہے ع

کاکُل ورُخسار کی باتیں کریں

لیکن کاکُل کی سیاہی اور رُخسار کی سُرخی کے بھی سیاسی معنے لیے جاتے ہیں۔ لکھنے والا بھی لے، پڑھنے والا لے گا۔ اور یہ کاکُل وغیرہ تو پُرانے زمانے میں بھی اپنا مذہب

دین ہم اہلِ اسلام سے الگ رکھا کرتے تھے اور حُسن چونکہ اُس زمانے میں صرف انگریزوں بلکہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے صاحبوں کے پاس ہوتا تھا۔ اِس لیے ہمیں کُہنی مار کر گھُس بیٹھ کر آگے نکل جاتے تھے۔ اُستاد ذوق نے کہ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی سے پہلے ہی اپنی عزّت اپنے ساتھ لے کر اور مسوّداتِ محمد حسین آزاد کے لیے چھوڑ کر انتقال کر گئے تھے اور جِن کے سیاسی شعور پر اُن کے شاگرد بھی اِصرار نہیں کرتے جو اچھّی بات ہے اور غالبؔ کے نام لیواؤں کے لیے قابلِ تقلید ہے۔ ایک جگہ لکھا ہے۔

خط بڑھا، زُلفیں بڑھیں، کاکُل بڑھے گیسو بڑھے

حسن کی سرکار میں جتنے بڑھے، ہندو بڑھے

پس حسن بھی موضوع سے خارج اور کاکُل بھی اور اِس کے دوسرے غیر مُسلم بھائی بند بھی تو بات کیا کی جائے۔ ولایت میں ایسے موقع پر صرف موسم کی بات کی جاتی ہے لیکن یہی موسم ہمارے شاعر کے ہاتھ آتا ہے تو اتنا معصوم نہیں رہتا۔ ع

فروغِ لالہ وصوتِ ہزار کا موسم

یہ سچ ہے ہمارے فیضؔ صاحب ہر شعر دونالی قلم سے لکھتے ہیں۔ ایک نال کوئے یار کی طرف، دوسری سوئے دار نشانہ لیے رہتی ہے۔ تاہم سیاست کا شائبہ رہتا ہے اور اِدھر کو مضمون زیادہ جھک جائے تو سیاست کے دربان کا کھٹکا۔ یہاں ولایت میں ایسا نہیں ہے۔ موسم بات کرنے کا بہانہ ہے۔ جھڑی لگی ہے، جان ضیق میں ہے اور زبان پر گُڈ مارننگ۔ جون گیا، جولائی کی تشریف آوری ہو گئی۔ اپنے ہاں کا موسم قارئین کرام جانیں۔ یہاں پچھلی اتوار ہم گھر میں بولائے ہوئے ہائیڈ پارک طرف نکل گئے۔ دھوپ بھی کھِلی تھی لیکن ہوا کا زور ایسا تھا کہ معلوم ہوتا تھا سیدھی برزنیف صاحب نے نشانہ باندھ کے سائبیریا یا ٹنڈرا کے میدانوں سے اِدھر بھیجی تھی۔ ہمارے دانت بجنے لگے جو کڑاکے کی سردیوں میں وہ کبھی نہ بجے تھے۔ جب تک گھر واپس آ کر ڈیڑھ رضائی کی بُکل میں نہ بیٹھے سکون نہ ہوا۔ اب بتایئے موسم کے اِتنے فرق کے ساتھ ہماری اور ہمارے قارئین کی سوچ کِس طرح ایک سی ہو سکتی ہے۔ خیر اِس برس سردی کا اب تک چلنا غیر معمولی ہو گا۔ پچھلے سال ہم نہ تھے، سُنا ہے یہاں غیر معمولی گرمی تھی لیکن دیس دیس میں رُت رُت کی بات الگ ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں برکھا کے خیال سے ملہار گاتے ہیں، یہاں رینی سیزن یعنی برسات کا بُرا مناتے ہیں۔ سچ یہ ہے کہ ہمیں تو یہاں بھی رِم جھِم اچھی اچھّی لگتی

ہے، اِس کے لیے جاڑا تک گوارا ہے۔ موسموں کے بارے میں ہمارا ایک شعر ہے۔

شام سے لے کر پَو پھٹنے تک کتنی رُتیں گزارتی ہیں

آس کی آندھی یاس کی پت جھڑ، صُبح کے اشکوں کی برسات

لیکن ہندی کا جو شعر یا کلام موسموں کے حوالے سے ہمیں پچھلے دِنوں بہت یاد آتا رہا۔ جانے کس کا ہے۔ ہم نے سکول کے زمانے میں پڑھا تھا:

برس رہی ہیں لہو کی بوندیں

رنگی ہوئی ہے لہو میں چولی

بناؤ ساون کہ ماس پھاگُن ؟

ملہار گاؤں کہ گاؤں ہولی ؟

اخبار اُٹھا کے دیکھتے ہیں تو یک طرفہ خبر نظر آتی ہے جو شیخ و برہمن کی آویزش کی یاد دلاتی ہے۔ صاحبانِ خیر میں سے ایک تو خیر سچ مُچ کے شیخ ہیں اور کسی معنوں میں بھی لیجیے بہت ہی شیخ ہیں، دوسروں کو اِس لحاظ سے برہمن کہہ لیجیے کہ جمال ہم نشیں اِن

میں کوئی بیس بائیس برس اثر کرتا رہا جس کے باعث پہلے بھی حکومت میں تھے، اب کے بھی حکومت میں ہیں۔ آپ نے پڑھ لیا ہو گا کہ بھارتی وزیرِ دفاع جنگ جیون رام نے شیخ عبد اللہ کو مشورہ دیا تھا کہ وہ اپنی خرابیٔ صحت کے باعث سیاسی زندگی سے ریٹائر ہو جائیں۔ شیخ عبد اللہ نے بجائے اِس کے کہ اِس مشورے کا شکریہ ادا کرتے جس کی فیس بھی جگ جیون جی نے نہیں مانگی۔ کیونکہ وزارتِ دفاع کی دی ہوئی تنخواہ اور اندرا گاندھی کے زمانے کا پراویڈنٹ فنڈ اُن کے لیے کافی ہے۔ بڑی دیدہ دلیری سے مشورہ دیا۔ لوٹا ہی نہیں دیا۔ جگ جیون رام صاحب کو یاد دلایا کہ اُن کی عُمر کتنی ہے اور صحت کا حال کیا ہے اور کیسے انہیں تھوڑے دِنوں پہلے دِل کا دورہ پڑا تھا۔ مستعفی ہونا چاہیے تو اُن کو ہونا چاہیے۔

ہم بڑے آدمیوں کے بیچ میں نہیں پڑتے۔ ہمارے دونوں محترم۔ ہمارے نزدیک دونوں ٹھیک کہتے ہوں گے اور ہماری ناقص رائے میں دونوں ایک دوسرے کے مشورے کو مان لیں تو ہماری مرنجان مرنج اور صلح کُل طبعیت کو خُوشی ہو۔ لیکن جب جیون رام جی کا بیان سیاست میں ایک طرح کی بدعت ضرور ہے۔ لوگ عام طور پر اپنے بارے میں کہا کرتے ہیں کہ میں خرابیٔ صحت کی بِنا پر مستعفی ہو رہا ہوں۔ اگرچہ بیان دینے کے بعد اکھاڑے میں ڈنڈ پیلنے بھی پہنچ جاتے ہیں۔ کسی دوسرے

کے باب میں ایسا کہنے کا دستور نہیں۔ حالانکہ خُدا لگتی پوچھئے تو یہ بات جِس کا دستور نہیں عقل کے زیادہ قریب ہے۔ ہاں اتنا مشورہ ہم دیں گے کہ مشورہ دیتے ہوئے بیان دینے والے کو اپنے مخالف کی ولادت کا سرٹیفکیٹ تصدیق شدہ میونسپلٹی اور صحت کا ڈاکٹری سرٹیفکیٹ مع خُون پیشاب کے ٹیسٹ بھیجنا چاہیے تاکہ مُخاطب انکار نہ کر سکے۔ عمر ہمیں بھی اِن صاحبوں کی معلوم نہیں۔ صرف قرائن سے سٹّرے بہتّرے لگتے ہیں۔ مُمکن ہے اِس سے بھی آگے کو پُہنچے ہوئے ہوں۔ صحت کا یہ ہے کہ یا تو معلوم ہوتا ہے کہ صُبح گئے یا شام گئے۔ ڈاکٹر گھنٹوں دِل پر ٹوٹی لگائے بیٹھا رہتا ہے یا یکایک ہوشیار ہو کر بیٹھ جاتے ہیں بلکہ خم ٹھونک کر پُکار اُٹھتے ہیں۔ نکالو تو کِدھر ہے بِلّی۔

پہلے آپ بھی ہمارے آداب اور تہذیب کا ایک لازمہ ہے جانے کتنے لوگوں کی گاڑیاں اِس میں نکل گئیں۔ دوسرے کو بِٹھا کر خود کھڑے رہنا بھی سعادت مندی اور شرافت کی دلیل ہے لیکن لوگ اِن آداب کو بھولتے جا رہے ہیں۔ انگریزوں کے ہاں سے خواتین کو اپنی نشست پیش کرنے کی رسم اُٹھتی جا رہی ہے۔ ہٹّے کٹّے لوگ بھد سے بیٹھ جاتے ہیں۔ ہمارے ہاں پھر غنیمت ہے کہ کوئی خوبصورت لڑکی ہو، نہ صرف اُس کے لیے جگہ خالی کرتے ہیں، بس میں بھی، اور جگہ بھی۔ بلکہ

کاندھوں سے پکڑ کر بِٹھاتے بھی ہیں۔

زمانۂ شُجاعت کی اکثر کہانیاں اور روایتیں جھوٹ سہی، لیکن ہائے کتنی اچھّی تھیں۔ جنگجو لوگ پہلے مخالف کو وار کرنے کی دعوت دیتے تھے کہ پہلے آپ۔ وہ بھی نسب کا اصیل ہوتا تھا۔ پہلے آپ سے جواب دیا تھا۔ اِس حیض بیض میں شام ہو جاتی تھی اور آگے کی تاریخ پڑ جائی تھی۔ یا یہ ہوتا تھا کہ جو اِن میں سے زیادہ سمجھ دار ہوتا تھا دوسرے کو غافل دیکھ کر اُس کی بات پر تسر تسلیمِ خم کر کے اُس کی بغل میں تلوار گھونپ دیتا تھا اور دوسرا تڑپتا پچھتاتا، شجاعت کے اصولوں پر نفریں بھیجتا اپنی بیوی کو بیوہ کرتا اور بچّوں کے سر سے اپنا سایہ اُٹھاتا۔ خُدا کی رحمت کے سائے میں پہنچ جاتا تھا۔ انہی لوگوں سے وضع داری کی زرّیں روایتیں قائم تھیں۔ آج کے لوگوں سے آپ یہ توقّع کر سکتے ہیں کہ طبلِ جنگ بج رہا ہے۔ اقوامِ متحدہ کے سبھی ممبر چھتریاں لگائے، کالے چشمے پہنے، تھرماس کندھے سے لٹکائے ہمہ تن اشتیاق کھڑے ہیں۔ اور امریکہ اور روس اپنے ہاتھ میں ہائیڈروجن بم لیے آمنے سامنے کھڑے تکلّف کر رہے ہیں۔ اجی پہلے آپ، اجی پہلے آپ۔ ع

پیارے یہ ہمیں سے ہوا ہر کارے و ہر مردے۔

سوامی جی لندن میں

یُوں تو لندن میں ایک سے ایک یوگی، ایک سے ایک سوامی، ایک سے ایک ہر ڑپویو بھرا پڑا ہے مثلاً آج ہی ماربل آرچ سے ہرے کرشنا والوں کا جلوس ڈھول ڈھمکے سے نکلے گا جو ناچتا گاتا اشلوک اور منتر پڑھتا ٹریفا لگر اسکوائر تک جائے گا۔ لیکن ایک تازہ وارد سوامی اِن سب سے بازی لے گئے ہیں۔ انہوں نے ابھی پچھلے دِنوں قدم رنجہ فرمایا ہے اور ایسے پکّے برہمچاری ہیں کہ عورت کو بُری کیا اچھّی نظر سے دیکھنے کے بھی روادار نہیں۔ چنانچہ بمبئی سے ہوائی جہاز میں آئے مع اپنے نو

حواریوں کے، تو حکم تھا کہ کوئی ائیر ہوسٹس اِدھر تشریف نہ لائے۔ فسٹ کلاس میں ایک طرف کو پردہ کئے بیٹھے رہے۔ لندن میں بھی یہی حکم تھا کسی عورت سے آمنا سامنا نہ ہو۔ ہوائی اڈّے والوں کو خاص انتظام کرنا پڑا۔ ہوائی اڈّے سے شہر بھی آئے تو آنکھیں موٹر کے فرش پر گاڑے رہے۔ کھڑکی سے باہر نہ جھانکا۔ اب بھی شہر سے باہر ایک سُنسان مقام پر مُقیم ہیں جہاں اَستری جاتی کا گُزر نہیں ہے۔ آپ ہیں سوامی نرائن فرقے کے گورو شری پرمکھ سوامی شاستری شری، لندن کے سارے اخباروں نے اِن کی تصویریں چھاپی ہیں۔ خشخشی داڑھی۔ سر پر زعفرانی پگڑی۔ صحت ماشاءاللہ اچھی بلکہ زیادہ ہی اچھّی۔ چنگا چوسا کھاتے ہوں گے۔

ہائے اِس دنیا میں کیسے کیسے لوگ ہیں۔ سوامی جی کی عُمر دمِ تحریر ۷۵ سال ہے اور ۱۷ برس کے تھے جب یہ گورو بنے اور وہ دِن اور آج کا دِن برہمچاریہ کے مارے عورت کی شکل دیکھنے کے روادار نہیں۔ حالانکہ سترہ برس کی عُمر جوانی کی راتوں اور مرادوں کے دِنوں کی عُمر ہوتی ہے۔ ہندوستان میں بہت سے لوگ تو اس وقت دو تین کی حد تک صاحبِ اولاد ہو چُکے ہوتے ہیں اور اندرا گاندھی کے زمانے میں بعضوں کی تو نس بندی تک کر دی جاتی تھی۔ دُور کیوں جایئے ہم اپنا ہی مُقابلہ شری سوامی سے کرتے ہیں کہ ہمیں نادم ہونا چاہیے یا خُوش ہونا چاہیے کیونکہ سوامی جی نے سترہ کی

عُمر کے بعد سے عورت پر نظر نہیں ڈالی اور ہم نے سترہ برس بلکہ اِس سے پہلے سے شروع کر کے کسی اور چیز کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا۔ عورت پر نہ صرف نظر ڈالی۔ کبھی کبھی اچھّی، لیکن زیادہ تر ویسی جیسی ڈالنی چاہیے بلکہ اُسے اعصاب تک پر سوار کر لیا جس کی شکایت علامہ اقبال مرحوم تک کو ہوئی۔ حالانکہ قرائن کہتے ہیں ایک زمانے میں خود اِن کے اعصاب کے تقاضے زیادہ مُختلف نہ تھے۔ کسی کی گود میں بلّی دیکھ لیتے تھے تو اُس پر نظم لکھ دیتے تھے۔ بلّی پر نہیں وہ تو بے چاری معصوم چیز ہے جس پر زیادہ سے زیادہ ہاتھ پھیرا جا سکتا ہے، بلکہ اُس پر۔ آپ سمجھتے ہیں نا؟

سوامی جی جمبو جیٹ طیّارے میں آئے۔ اور اکانومی کلاس میں ہما شما کے ساتھ نہیں، فرسٹ کلاس میں بیٹھ کے آئے۔ یہ بھی ہندوستان میں روحانیت کے لوازم میں سے ہے۔ مشہور مصنّف وید مہتا نے پچھلے دِنوں گاندھی جی پر ایک کتاب لکھّی ہے جس کی آج بھی بڑی تعریف ہو رہی ہے۔ خود انہوں نے گاندھی جی کی بڑی تعریف کی ہے۔ بس ایک دو باتیں لکھ گئے ہیں جو ہم بوجہ مہاتما جی کے احترام کے لکھنے کی جرأت نہ کرتے۔ ایک یہ کہ اُن کو غریبی کی حالت میں رکھنے پر بڑا پیسہ خرچ کرنا پڑتا تھا مثلاً سفر تھرڈ کلاس میں کرتے تھے۔ بکری سمیت تو پورا ڈبّہ ریزرو ہوتا ہے۔ سیکنڈ یا فرسٹ کلاس کی سیٹ اِس سے سستی رہتی۔ پھر محض یہ آزمانے کے لیے کہ

انہوں نے اپنے نفس کو کُچل دیا ہے جو ان جہان لڑکیوں کو ساتھ لِٹاتے تھے۔ ہماری پُرانی داستانوں میں ایسے موقع پر ہیرو نا محرم لڑکی کے ساتھ لیٹنے کے موقع پر رفعِ شر کے لیے درمیان میں تلوار رکھ لیتا تھا۔ لڑکی کے جُز بُز ہونے کی پروانہ کرتا تھا۔ گاندھی جی تلوار کیا چرخہ تک درمیان میں نہ رکھتے تھے، بس اپنی روحانیت کے پر شیطان کے شر سے محفوظ رہتے تھے۔ اِس معصوم لڑکی کو بھی جس کی روحانیت مہاتما جی کے عشر عشیر بھی نہیں ہوتی تھی، کوئی اور گھر ڈھونڈنا پڑتا تھا۔

ایک زمانے میں ایک اُردو شاعر کی نظم پڑھی تھی۔ یہ اِن مِصرعوں پر ختم ہوتی تھی۔

میں کنوارا ہی رہا

کاش میرا باپ بھی۔۔۔

ہمیں معلوم نہیں اِن سوامی جی کو بھی افسوس ہوتا ہے یا نہیں کہ میرے باپ بھی سوامی نرائن فرقے کے برہمچاری کیوں نہ ہوئے۔ اگر وہ ناخلف نہیں تو ایسا احساس ہونا ضرور چاہیے۔ اِس وقت سوامی جی کے چیلیوں کی تعداد دس لاکھ بتائی جاتی ہے۔ اِن میں کُچھ ایسے ضرور ہوں گے جو اندھیرے اُجالے میں چُوکتے نہ ہوں گے۔ تاہم ایک بڑی تعداد نے از خود اپنی نفسانی نس بندی کر رکھی ہے۔ اے کاش اندرا

گاندھی ڈاکٹروں کو مخلوق کے پیچھے لگانے کی بجائے سوامیوں کو لگائیں اور جبری نس بندی کا الزام اپنے سر نہ لیتیں۔ مُمکن ہے اُس وقت تک خود وہ بھی قائل ہو گئی ہوں کہ سنجے جیسے نونہالوں کو وجود میں لانے کی نسبت سوامی نائن فرقے کا پیرو کار ہونا بہتر ہے۔ سنجے گاندھی کو تو ہم ناخلف نہیں کہہ سکتے۔ اُن کے بزرگوں کو اِس لحاظ سے ناخلف کہا جا سکتا ہے۔ بہر حال بات سوامی جی کی ہے جو انگریزوں کو روحانیت سے مالا مال کرنے کے لیے اگست تک کے لیے برطانیہ آئے ہوئے ہیں۔ ہزاروں لاکھوں لوگ اور بھی آتے ہیں لیکن اِس سے برعکس مقاصد لے کر۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ دونوں قسموں کے لوگوں میں سے کس سے خطاب کر کے کہیں کہ ؏

ہائے کم بخت تو نے پی ہی نہیں

کیونکہ ہمارا مسلک باما شراب خوردن و بہ زاہد نماز کردن کا ہے۔ ہم نے ایک بار لکھا تھا کہ ہم فِلموں میں بے حیائی کے بہت خلاف ہیں۔ ایک فِلم اِس قسم کی تھی چنانچہ ہم سارا وقت نظریں فرش پہ گاڑے کان ہی کان میں مکالمے سُننے اور مُنہ ہی مُنہ میں لاحول پڑھتے بیٹھے رہے۔ جب فِلم ختم ہوئی تو ایک صاحب نے جو ہمارے پاس بیٹھے تھے ہم سے کہا۔ حافظ جی آپ کو باہر چھوڑ آؤں؟ جی تو چاہا کہ اُس کی خوب سی خبر لیں کہ اندھے تو تُم ہو جو ایسی شرمناک فلمیں دیکھنے آتے ہو۔ ہم اندھے نہیں۔

ہماری آنکھیں نورِ بصیرت سے روشن ہیں۔ پھر در گزر کیا کہ عامی لوگ انہی کی حمایت کریں گے۔ ہمیں معلوم نہیں سوامی جی پر بھی لوگوں نے ایسا گُمان کیا ہے یعنی اِن کو آنکھوں کا معائنہ کرانے اور ممیرے کا سُرمہ اِستعمال کرنے کا مشورہ دیا ہے یا نہیں۔

کیلے دُکیلے کا خُدا حافظ

آپ نے کبھی کیلا دیکھا ہے؟ کھایا ہے؟ کھایا نہیں تو کبھی اِس پر پھِسلے ضرور ہوں گے۔ پھسلتا بھی آدمی اچھّی چیز پر ہے، ہماری مثال لیجئے۔ جہاں اچھّی صورت دیکھی، بُری طرح اُس پر پھِسل گئے۔ جو اچھّی صورت پر نہیں پھِسلتے، پیسے پر پھِسل جاتے ہیں۔ ظاہر ہے پیسہ بھی اچھّی چیز ہے بلکہ انصاف یہ ہے کہ اچھّی صورت سے زیادہ اچھّی چیز ہے کیونکہ میسّر ہے تو اچھّی صورت بھی اِس سے حاصل کر سکتے ہیں۔ جبکہ اچھّی صورت بعض اوقات پیسے کے نقصان کا باعث بن جاتی ہے۔ بہر حال مقصدِ

گُفتگُو کا یہ کہ کیلے کو کسی طرف سے دیکھئے، کسی طرف سے کھائیے، کسی طرف سے اس پر پھسلئے، اچھّی چیز ہے۔ اور بھی کھیل ہیں زمانے میں ۔۔۔۔ کیلے کے سوا۔ لیکن انہیں محض دیکھ سکتے ہیں یا زیادہ سے زیادہ دِکھا سکتے ہیں، اُن پھِسل نہیں سکتے۔

برطانیہ کے ایک اخبار نے ایک لمبا چوڑا مضمون چھاپا ہے جس میں برطانیہ کی معاشی بدحالی کی وجہ آخر دریافت کر لی ہے۔ اِس سے پہلے ایک پُرانا لطیفہ سُنئیے۔ ٹریفالگر اسکوائر میں ایک لمبی لاٹ کے اوپر نیلسن کا بُت ہے۔ امیر البحر نیلسن کا شُمار برطانیہ کے قومی ہیروؤں میں ہوتا ہے۔ اُس نے کیا کِیا تھا وہ بھول گئے ہیں کیونکہ اُس کے کارنامے ہم نے میٹرک کی جماعتوں میں پڑھتے تھے اور امتحان کا نتیجہ نکلتے ہی فراموش کر دیئے تھے۔ بہرحال اگر وہ ہیرو نہ ہوتا تو اُس کا بُت اتنی نمایاں جگہ پر کیوں نصب کرتے۔ اتّفاق سے ایک غیر مُلکی سیّاح اِدھر آ نِکلا اور اُس نے بُت کی طرف اشارہ کر کے ایک انگریز سے پوچھا کہ یہ کون ذات شریف ہیں۔ اُس نے چھاتی پھُلا کر کہا۔ یہ نیلسن کا مجسمہ ہے۔ وہ کوئی سادہ لوح تھا بولا۔ نیلسن کون؟ انگریز نے بہت حیران ہو کہ کہا نیلسن کو نہیں جانتے۔ آج جو کُچھ تُم اس ملک میں دیکھ رہے ہو اِسی کی بدولت تو ہے۔ اِس کا اشارہ تو ضرور برطانیہ کی عظمت وغیرہ کی طرف ہوگا لیکن سیّاح کا رُحجان اقتصادیات کی طرف زیادہ تھا۔ چچ چچ کر کے ملامت کے لہجے

میں انگریز بہادر سے کہنے لگا کہ سارا الزام ایک آدمی کے سر ڈال دینا زیادتی کی بات ہے۔

اب آیئے بر سرِ مطلب۔ اِس اخبار نے برطانیہ کی معاشی بد حالی کا سارا الزام کیلے کے سر ڈال دیا ہے۔ یہ بھی ایسی ہی زیادتی ہے۔ ایسے میں ہمارے ہاں طویلے کی بلا بندر کے سر ڈالنے کا محاورہ ہے حالانکہ بندر اور کیلے میں کوئی نسبت نہیں سوائے اِس کے کہ بندر بھی کیلا شوق سے کھاتا ہے۔ آخر انسان کا مورثِ اعلیٰ ہے۔ ہم نہ مانیں، انگریز تو مانتے ہیں۔

بہر حال انگریز کیلا رغبت سے کھاتا ہے اور تھوڑا بہت نہیں سال کے سال تین لاکھ ٹن ہڑپ کر جاتا ہے اور یہ سارے کا سارا باہر سے آتا ہے۔ انگریز کے ہاں بہت سی چیزیں ہوتی ہیں۔ جمہوریت کے باوجود بادشاہت تک ہوتی ہے۔ لیکن کھانے کی زیادہ تر چیزیں باہر سے آتی ہیں۔ معلوم ہے کھانے کی چیزوں کی درآمد پر انگریز سالانہ کتنے پیسے خرچ کرتا ہے؟ ساڑھے چار بلین پونڈ۔ ملین نہیں کہ فی زمانہ امریکیوں کی مہربانی سے معمولی چیز ہو گئی ہے بلکہ بلین مساوی ایک سو ملین۔ اگر ہمارا حساب ٹھیک ہے تو یہ ۴۵ کروڑ پونڈ بنتے ہیں جو پونڈ سستا ہونے کے باوجود ہمارے سِکّے میں سات ارب ۶۵ کروڑ روپے کے برابر ہے جس کا نِصف بھی بہت

ہوتا ہے۔ اِس در آمد کے باعث برطانیہ کا توازن ادائیگی ڈانواں ڈول بلکہ اکثر خسارے کی طرف رہتا ہے اور ورلڈ بنک کے سامنے کشکول پھیلانا پڑتا ہے۔ ظاہر ہے کھانے کی چیزیں مکھّن وغیرہ تک باہر سے آئیں گی تو مہنگی بھی ہوں گی۔ چنانچہ غذائی اشیا کی مہنگائی کے باعث یہاں کے گھروں میں ہاہاکار بھی مچتی ہے۔ کارٹون میں مبالغہ تو ہوتا ہی ہے لیکن ذرا یہ کارٹون دیکھئے کہ چار آدمیوں کی سیٹ پر بس میں آٹھ آدمی بیٹھے ہیں۔ بے چاروں کی فاقے کرتے ہڈّیاں نکل آئی ہیں اور کنڈکٹر (جو خود جانے کِس چکّی کا پیسا کھاتا ہے) محفوظ ہو کر کہہ رہا ہے کہ خُدا کی شان ہے کبھی اِس سیٹ پر تین آدمی پھنس کر بیٹھا کرتے تھے۔

اخبار والے نے حساب لگایا ہے کہ ۱۹۷۶ء میں پانچ کروڑ پونڈ یعنی پچاسی کروڑ روپے کا کیلا آیا۔ کیوں آیا؟ کیا ہم کیلے کے بغیر نہیں رہ سکتے؟ ہمیں تو چائے بھی بند کرنی چاہیے تھی جو ہماری خوشحالی کے دِنوں کی یادگار ہے۔ جب سلطنت پر سورج غروب نہیں ہوا کرتا تھا مقبوضات سے مُفت آجاتی تھی لیکن اب زمانہ بدل گیا ہے۔ سلطنت کی بات تو کیا کیجئے کہ رفت گزشت ہوئی۔ اب تو کبھی کبھی اندرون مُلک بھی سورج طلوع نہیں ہوتا۔ پھر یہ کہہ کر چائے تو ہم نہیں چھوڑ سکتے کیونکہ اِس کے بغیر کوئی دفتر نہیں چل سکتا، فیکٹری نہیں چل سکتی اور کافی اِس سے زیادہ مہنگی ہے لیکن

کیلے کی درآمد پرتگال اور یونان نے بند کر دی ہے تو ہم بھی کیوں نہ کریں۔ اِس کا ذائقہ بھی کُچھ ایسا نہیں۔ یُوں لگتا ہے جیسے بھیگا ہوا بلاٹنگ پیپر مُنہ میں رکھ لیا جائے۔ تھوڑا سا میٹھا ڈال کر۔ اس سے زیادہ غذائیت تو ہمارے آلو میں ہوتی ہے وغیرہ وغیرہ۔ ہمیں پُرتگال اور یُونان کی معیشت کا زیادہ عِلم نہیں لیکن خیال یہ ہے کہ وہ کیلا نہ کھانے کے باوجود بہت مضبوط نہیں ہے۔ برطانیہ سے بہتر نہیں ہے۔ بھر نزلہ اِس عضوِ ضعیف پر گِرانے کا فائدہ؟

اب سوال یہ ہے کہ جن مُلکوں کی معیشت کا دارو مدار بڑی حد تک کیلے کی برآمد پر ہے وہ کیا کریں؟ اخبار والے نے اِس میں بھی خوبی کا نکتہ دریافت کر لیا ہے کہ وہاں سے کیلا نہ آئے گا تو وہاں کے لوگوں میں غریبی اور بدحالی پھیلے گی اور وہاں انقلاب آئے گا اور مساواتی نظام رائج ہو گا۔ لیکن لکھنے والوں نے دو نکلتے نظر انداز کر دیے ہیں۔ ایک تو یہ کہ انقلاب والے مُلکوں میں بھی آدمی سارا وقت کیلا کھا کر گزارہ نہیں کر سکتا اور دوسرا یہ کہ انقلاب اچھّی چیز ہے تو اِسے اپنے ہاں کیوں نہ لایا جائے بلکہ کیلے اور دوسری برآمدات کو گھٹانے کی بجائے دُگنا چوگُنا کر لیا جائے۔ معاشی بدحالی جلد نقطۂ عُروج کو پُہنچے گی اور انقلاب اور مساواتی نظام کل کے آئے آج آئیں گے۔ ع

ایک ان ہی کا بھلا ہو ہمیں منظور نہیں

یہ کیسے مسیحا ہیں، دوا کیوں نہیں دیتے

یہاں اخبار میں کسی کا مراسلہ چھپا ہے کہ صاحب اگر کسی کے دانت میں ہفتے یا اتوار کو جب ڈاکٹروں کی چھُٹّی کا دِن ہوتا ہے، درد اُٹھے تو وہ کیا کرے۔ یہاں اسپتال ضرور ہیں جو ایمرجنسی کے کیس لیتے ہیں لیکن وہ بھی کہتے ہیں کہ آپ کا جبڑا ٹوٹ گیا ہو تو بسم اللہ آیئے۔ دانت کا درد کوئی ایمرجنسی نہیں ہے۔ اِسے ہم قبول نہیں کرتے۔

ایک بار ہم نے اپنے مُلک میں کسی اسپتال میں ہی لکھا دیکھا تھا کہ یہاں ۹ بجے سے ۵

بجے تک کتّوں کے کاٹے کا علاج ہوتا ہے۔ ہم نے لوگوں کو مشورہ دیا تھا کہ وہ خود کو کتّوں سے صرف اِن ہی اوقات کے اندر کٹوائیں کہ یہ اُن ہی کے مُفاد کی بات ہے۔ کٹوانے والوں کے مُفاد کی۔۔۔۔۔۔ کتّوں کے مُفاد کی نہیں۔ پھر کِسی بھلے مانس نے سوال اُٹھایا کہ یہ مشورہ کُتّوں کو دینا چاہیے کہ وہ صرف اِن اوقات کے اندر کاٹیں لیکن اِس میں چند در چند قباحتیں تھیں۔ سارے کُتّوں کو گھڑیاں یا ٹائم پیس فراہم کرنے پڑتے یا روزانہ نو بجے اور پانچ بجے توپ چلانی پڑتی یا سائرن بجانا پڑتا پھر بھی کوئی ضروری نہیں کہ کُتّے بات سمجھتے۔ اخباروں میں اعلان کیا جا سکتا تھا، پوسٹر چھاپے جا سکتے تھے لیکن مُشکل یہ ہے کہ ہمارے ہاں کے بہت سے کُتّے تعلیم یافتہ نہیں ہیں۔ جِس مُلک میں اٹّھارہ فیصدی انسانوں کی تعلیم کی اوسط ہو اُس میں کُتّوں کی تعلیم کا زیادہ بندوبست مُشکل ہے۔ ہم کبھی وزیرِ تعلیم بنے، تمام تر توجّہ کریں گے۔ یہ بات نہیں کہ سبھی کُتّے اَن پڑھ ہوتے ہیں۔ جِن لوگوں نے دُکانوں، پارکوں کے باہر نوٹس لگا رکھے ہیں کہ یہاں کُتّوں کا داخلہ منع ہے، وہ بے وقوف نہیں ہیں۔ ہم نے خود بعض کُتّوں کو دیکھا ہے کہ دُم لہراتے ذوق و شوق سے آئے اور جہاں بی نوٹس دیکھا، پابندِ قانون شہریوں کی طرح اپنا سا مُنہ لے کر اور دُم ڈھیلی کر کے واپس چلے گئے۔

پس ہم یہاں ولایت کے مریضوں کو مشورہ دیں گے کہ ہفتے اتوار کو دانت کا درد نہ اُٹھنے دیں۔ پیر کا انتظار کریں۔ بلکہ منگل کا۔ یہاں یہ دستور نہیں کہ آپ بیمار ہوئے تو اُٹھ کے قارورے کی شیشی لے کر حکیم کے پاس یا ڈاکٹر کے پاس چلے گئے۔ یہاں فون کر کے پہلے اپائنٹمنٹ لیجئے۔ ہمارے ساتھ کئی بار ہو چکا ہے کہ شدید درد اُٹھا یا کھانسی لاحق ہوئی، گلا سوج گیا۔ ہمارے ڈاکٹر کی سیکرٹری نے بہت کہا کہ کل تک حالت اور بگڑ جائے گی لیکن اصول ہوں ہے۔ ہمارے مُلک کی طرح بے اصولی نہیں کہ ڈاکٹر نے بے وقت بھی دیکھ لیا اور دوا دے دی۔ پھر یہاں ڈاکٹر کے پاس دوا نہیں ہوتی۔ صرف اسٹیتھسکوپ اور مشورہ ہوتا ہے۔ پرچی لکھ دیتا ہے کہ فلاں اسپتال جاؤ اور ایکسرے کراؤ اور پھر فون کر کے وقت لے کر آؤ۔ یا کیمسٹ سے یہ دوا بنوا لو۔ جب مہینہ یا اتوار ہوتا ہے تو یہ بیمار سخت لاچار ہوتا ہے۔ ع

جو جل اُٹھتا ہے یہ پہلو تو وہ پہلو بدلتا ہے

ہمارے ہاں عطائیوں کا دم غنیمت ہے کہ ڈاکٹر کی چھُٹّی ہو تو مریض کی دستگیری کرتے ہیں۔ کبھی کبھی تو اُس کا ہاتھ پکڑے پکڑے اُسے قبرستان تک پہنچا آتے ہیں۔ لیکن عام حالات میں مریض کا اطمینان ہو جاتا ہے کہ دوا تو ملی۔ آگے شفا اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ دینے والے نے گُڑ نہ دیا۔ گُڑ کی سی بات تو کی۔

دانت کا درد بڑی ظالم چیز ہے لیکن دانت کا ڈاکٹر اِس سے بھی ظالم چیز ہے۔ ہم یہاں کی بات کر رہے ہیں۔ اپنے مُلک کی نہیں جہاں دانت نکالنے کے لیے ڈاکٹر کی ضرورت نہیں۔ لوگ فُٹ پاتھ پر کھڑے کھڑے زنبور ڈال کر نکال دیتے ہیں اور جہاں لکڑ ہضم پتھّر ہضم قسم کے منجن ہر جگہ دستیاب ہیں۔ یہاں ہمارے ایک دانت میں تکلیف ہوئی، ہم اُس کے پاس گئے۔ یہاں کے دانتوں کے ڈاکٹر دوا وغیرہ نہیں جانتے۔ ہمیں تب ہوش آئی جب انہوں نے ایک ساتھ ہمارے تین دانت نکال کر سامنے رکھ دیے۔ ہم نے کہا اِن دو کا کیا قصور ہے۔ اِن میں تو درد نہیں ہوتا تھا۔ ڈاکٹر تھا دور اندیش قسم کا۔ بولا آج نہیں تو پھر کبھی ضرور ہوتا۔ اب سُن کرنے کے ایک انجکشن لگانا پڑتا۔ آپ کو تکلیف ہوتی۔ ہم قائل ہو گئے بلکہ ہونا پڑا کیونکہ اِس کے بغیر چارہ نہ تھا۔ دانت تو وہ دوبارہ ہمارے جبڑے میں ٹھونک نہ سکتا تھا۔

ہم لکھ چکے کہ یہاں عربوں کی ریل پیل ہے۔ ہمارا محلّہ عین مرکزی لندن میں آکسفورڈ اسٹریٹ کے پاس ہے۔ شام کو پوری سڑک پر مرد، بچّے، بُوڑھے چغے پہنے سڑک پر گھومتے اور دُکانوں میں خریداری کرتے نظر آتے ہیں اور عورتیں کالے برقعے پہنے، ناک پر چونچیں لگائے یا بغیر برقعے کے دروازوں کھڑکیوں، سیڑھیوں میں کھڑی دکھائی دیتی ہیں۔ ہم نے آج کل عربی پڑھنی شروع کر دی ہے۔ آخر

لندن میں رہنا ہے۔ چونکہ عرب کا مطلب کروڑپتی ہوتا ہے لہٰذا ہر چیز کے دام چڑھ گئے ہیں اور ڈاکٹروں کی بھی چاندی ہو گئی ہے بلکہ سونا کہیئے، حتّٰی کہ متحدہ عرب امارات کے میڈیکل اتاشی ڈاکٹر جمعہ بلال نے کل خبر دار کیا کہ اگر ڈاکٹروں نے لوٹ کھسوٹ جاری رکھی تو ہمارے ہاں کے لوگ علاج کے لئے دوسرے یورپی ممالک جرمنی وغیرہ جانے لگیں گے۔ جب سر پھوڑنا ٹھہراءٔ

تو پھر اے سنگ دل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو؟

ڈاکٹر بلال نے بتایا کہ دانتوں کے ایک ڈاکٹر نے ایک عرب مریض کو ساڑھے تین ہزار پونڈ کا بِل دیا اور ایک ظالم نے تو دس ہزار پونڈ یعنی ہمارے ایک لاکھ ستّر ہزار روپے کا بِل بنا دیا۔ ڈاکٹر بلال نے کہا کہ یہاں کے عام ڈاکٹر ایسے دندان شکن بِل نہیں دیتے جتنا دانتوں کے ڈاکٹر دیتے ہیں۔ اگر کسی کو دِل کا عارضہ ہو تو اُس کی سرجری کا بِل اِس سے تہائی یا چوتھائی ہوتا ہے۔

ہمارا مشورہ آج تک کسی نے مانا نہیں ورنہ ہم یہاں آنے والے مریضوں کو مشورہ دیتے کہ وہ اپنے دِل کا علاج کرائیں خواہ درد اُن کے دانت ہی میں کیوں نہ ہو۔ کیونکہ سستا پڑے گا اور جیسا کہ ہمارے دندان ساز نے ہمیں دِلاسا دیا تھا، ہم بھی

کہیں گے کہ دِل میں آج نہیں تو کل درد ہو سکتا ہے۔ آج کل دِل کی بیماریاں عام ہیں۔ پس کیوں نہ آج اِسی دور اندیشی سے کام لیا جائے۔ دانتوں کا کیا ہے، ہوئے ہوئے، نہ ہوئے، نہ ہوئے۔

آخر بعض جانور بغیر دانتوں کے بھی ہوتے ہیں مثلاً۔۔۔ مثلاً۔۔۔ ہمیں اِس وقت صرف جونک یاد آتی ہے، اور کبھی ہوں گے۔ حکمت یعنی عِلمِ طِب میں دور اندیشی بڑی ضروری چیز ہے۔ ایک صاحب کے پیٹ میں درد تھا۔ انہوں نے فرمایا جلی ہوئی روٹی کھالی تھی۔ انہوں نے اُن کی آنکھ میں دو دو قطرے دوا کے ڈال دیے۔ مریض نے کہا حضرت درد تو پیٹ میں ہوتا ہے۔ حکیم صاحب نے کہا کہ آنکھوں کا علاج مقدّم ہے۔ کیونکہ تُجھے یہ نظر نہیں آیا کہ روٹی جلی ہوئی ہے۔ بیماری میں دور اندیشی کے اور بھی مقامات آتے ہیں۔ ایک صاحب نے کہ بیمار تھے، اپنے نوکر کو بھیجا کہ حکیم صاحب کو لے آؤ۔ وہ حکیم صاحب کو لے آیا اور دو اور آدمیوں کو بھی جِن میں ایک کی بغل میں کپڑے کا تھان اور دوسرے کے کاندھے پر پھاؤڑا تھا۔ مریض نے کہا یہ تو حکیم صاحب ہوئے۔ اِن دو صاحبوں کی تعریف؟ نوکر بولا۔ حضور یہ کفن سینے والے ہیں اور یہ گورکن ہیں۔ یوں تو حکیم صاحب بڑے حاذق ہیں اور اِن کے ہاتھ میں شفا ہے، پھر بھی دور اندیشی اور احتیاط کا تقاضا تھا کہ۔۔۔۔

آغاز تاریخِ انگلستان کا

جدید اُردُو ریڈر۔ حصّہ دوم

عزیز طالب علمو! آؤ آج تاریخِ انگلستان کا مطالعہ کریں۔

انگلستان کی تاریخ کا کُچھ مطالعہ ہم نے ہائی اسکول کے دِنوں میں بھی کیا تھا لیکن جلد ہی بیزار ہو گئے تھے۔ کیونکہ اِس میں اتنے سارے ایڈورڈ اور جارج اور ہنری آتے ہیں کہ اُن کو ایک دوسرے سے الگ کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔ جیمس اور چارلس اور

رچرڈ اور جان وغیرہ اس پر مستہزاد اور مَلِکائیں اِس کے علاوہ۔ انگریزوں کو بادشاہ تو ملتے تھے لیکن اُن کے نام نہیں ملتے تھے۔ لہٰذا ایک دو نام لے کر اُن پر نمبر شمار ڈالتے رہتے تھے۔ ہمارے ہاں ہم نامی کا چکّر زیادہ نہیں۔ یُوں خاندانِ مُغلیہ کے آخری دنوں میں ایک آدھ اکبر شاہ یا اکبرِ ثانی ہوا یا ایک دو شاہ عالم یکّے بعد دیگرے ہوئے۔ ورنہ بادشاہ کیسا بھی ہو، نام اُس کے لیے ڈھونڈ ڈھونڈ کر عمدہ اور فصیح و بلیغ لاتے تھے۔ فرح سیر، رفیع الدّولہٗ، رفیع الدّرجات وغیرہ۔ انگلستان کے بادشاہوں میں بہت سے جارج، ایڈورڈ اور ہنری ہونے کا نتیجہ یہ ہے کہ کارنامے بیان کرنے لگیں تو وہ کئی ہوتے ہیں۔ کسی داڑھی والے نے اور پکڑا جاتا ہے مونچھوں والا۔ آپ نے انگلستان کے بادشاہوں کی تصویریں دیکھی ہوں گی۔ اِن میں کئی داڑھیوں والے تھے۔ کئی محض مُونچھوں والے اور بعض صرف سر پر پٹّے رکھتے تھے۔ وہ بھی ہمیشہ اصلی نہیں بلکہ اکثر مصنُوعی۔ اِن میں ہنری ہشتم کی آٹھ بیویاں تھیں لیکن اِس سے یہ قیاس کرنا غَلَط ہو گا کہ اِس وجہ سے وہ ہشتم کہلاتا تھا اور ہنری ہفتم کی سات اور ہنری ہشتم کی چھ زوجائیں ہوں گی۔ بعضوں کو تو ایک بھی نصیب نہ ہوتی تھی۔ ایڈورڈ ہشتم ہی کو لیجئے۔ بے چارے کو ایک بیوی کرنے کے لیے اپنا تخت تک چھوڑنا پڑا۔ وہ بھی امریکن اور پہلے سے بیاہی نکاحی۔ ہمارے اور انگلستان کے بادشاہوں

میں ایک فرق یہ بھی ہے کہ انگلستان کا ایک ایک بادشاہ بیک وقت کئی کئی جگہ دفن ہے، سر کہیں، دھڑ کہیں، کان کہیں، ناک کہیں، دِل کہیں، کلیجہ کہیں۔ مقصود یہ تھا کہ مختلف جگہ اِن کی مغفرت کی دُعائیں کی جا سکیں۔ اِن میں سے بعض کے اعمال بھی ایسے تھے کہ ایک آدھے جگہ مغفرت کی دُعا کافی نہ پڑی۔

تاریخِ انگلستان میں ہمیں زیادہ گہرا جانے کی ضرورت نہیں۔ خود انگریز بھی زیادہ گہرا نہیں جاتے بلکہ کوئی بھی قوم اتنا گہرا نہیں جاتی جتنا ہم جاتے ہیں کہ بعض اوقات باہر نکالنا دشوار ہو جاتا ہے۔ کوئی کُنڈا اچھینک کر نکالے تو نکالے۔ دراصل کئی صدیاں تو اِس مُلک میں طوائف الملوکی کی رہیں۔ یہ نہیں کہ طوائفوں کا راج تھا بلکہ جس کی لاٹھی اُسی کی بھینس کا معاملہ تھا۔ بھینسیں اِس مُلک میں زیادہ نہ تھیں۔ اب بھی نہیں، لیکن لاٹھیاں خاصی تھیں۔ یا پھر شمالی یورپ کے وائی کنگ سر پر سینگ لگا کر (تاکہ کوئی اُن کو گدھا نہ سمجھ لے) اور ہاتھوں میں کھانڈے لے کہ ہر طرف خُون خرابہ کرتے پھِرتے تھے۔ اِن دِنوں یہاں کوئی انیک پاول نہ ہوتا تھا۔ نہ نیشنل فرنٹ کا زور تھا۔ لہٰذا نہ صِرف باہر سے کام یا مزدوری یا لڑائی کے لیے آنے والوں پر کوئی پابندی نہ تھی۔ بلکہ یہاں کے لوگ اُنہی میں سے بعض کو بڑے ذوق و شوق سے بادشاہ بناتے تھے اور اُس کو سر آنکھوں پر بِٹھاتے تھے۔ جہاں تک ہمارا مطالعہ

ہے انگلستان میں صحیح النسل انگریز بادشاہ کوئی بھی نہیں ہوا۔ پاتوڈین یعنی اہلِ ڈنمارک نے راج کیا یا نارمن یعنی نارمنڈی کے فرانسیسی آئے یا جرمنوں نے حُکمرانوں کی۔ انگلستان کا موجودہ خاندان بھی جرمن نسل کا ہے۔ انگلستان والے حسب نسب کے معاملے میں بھی عموماً سیر چشمی، وسیع الظّرفی اور درگزر سے کام لیتے تھے۔ اِن کے کئی بادشاہ تو صاف حرامی تھے جس کی تصدیق مؤرّخوں نے بھی کی ہے اور خُود اُن کے والدین کا بھی یہی بیان تھا۔ مثلاً ولیم فاتح ہیرالڈ اوّل۔ بعض اِن میں ماں کی طرف سے حرامی تھے۔ بعض باپ کی طرف سے اور بعض نجیب الطرفین یعنی دونوں طرف سے حرامی بھی تھے۔ جو لوگ حسب نسب کے لحاظ سے ٹھیک ٹھاک تھے وہ اپنے عمل اور کردار سے اپنے کو ایسا ثابت کرنے کی کوشش کرتے تھے اور اِس میں بالعموم کامیاب رہتے تھے۔

انگلستان کی تاریخ میں سب سے پرانا نام حکمرانوں میں مَلِکہ بودیشیا کا ملتا ہے۔ پہلی صدی عیسوی کی بات ہے۔ یہ بڑی لحیم شحیم خون خوار مَلِکہ تھیں۔ اِن کے رَتھ کے پہیّوں میں تیز دھار چاقو کے پھل لگے رہتے تھے۔ جہاں سے رَتھ گزرتا تھا لوگوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹ دیا جاتا تھا۔ انگلستان میں اور بھی کئی مَلِکائیں ہوئی ہیں لیکن اِن میں سے اکثر کا انتقال بستر میں ہوا۔ بعض کا اپنے بستر میں بعض کا کسی اور کے بستر

میں۔ ایک دو کا سر قلم کرنا پڑا لیکن مَلِکہ بودیشیا چونکہ میگنا کارٹا سے بہت پہلے پیدا ہوئی تھی اور بااختیار مَلِکہ ہونے کے ساتھ مردِ میدان بھی تھیں اِس لیے جب اُن کو رومنوں کے مُقابلے میں شکست ہوئی تو انہوں نے زہر کھا کر اپنی جان لے لی۔ اتنا زہر اُن دِنوں میسّر نہ تھا کہ کسی اور کی تواضع اِس سے کر سکتی۔ ایسی غیرت مند مَلِکہ پھر انگلستان کی تاریخ میں کوئی نہ ہوتی۔

آپ نے کنگ آرتھر کا نام بھی سُنا ہو گا۔ کُچھ لوگ کہتے ہیں کہ یہ ہوا ہی نہیں۔ کُچھ کہتے ہیں ضرور ہوا ہو گا۔ اُس کی راؤنڈ ٹیبل یعنی گول میز مشہور ہے۔ جِن لوگوں کا خیال ہے کہ راؤنڈ ٹیبل کانفرنس مرحوم صدر ایّوب نے ایجاد کی تھی یا اب سے چالیس پچاس برس پہلے انگریزوں نے سب پہلے گول میز بِچھائی تھی اور اِس پر سر آغا خاں اور ڈاکٹر سر محمد اقبال وغیرہ کو بٹھایا تھا وہ غَلَطی پر ہیں اور تاریخ انگلستان سے بے بہرہ ہیں۔ سب سے پہلی گول میز ِکنگ آرتھر نے، وہ خود ہوا ہو یا نہ ہو، بنوائی تھی اور اِس کے گرد اپنے سرداروں سر لانسیلاٹ وغیرہ کو بِٹھاتا تھا اور اِن سے مذاکرات وغیرہ کرتا تھا۔ سر کا لفظ ہمارے خیال میں سردار ہی سے نکلا ہے۔ سرداروں میں سے جو لوگ بغاوت کر کے سوئے دار چلے جاتے تھے وہ کیفرِ کردار کو پہنچ جاتے تھے۔ جو سمجھ دار تھے اور کوئے یار کی فضا کو ترجیح دیتے تھے وہ سر کا

خطاب پاتے تھے۔ چنانچہ لانسیلاٹ سے لے کر سر چھوٹورام تک یہ سِلسِلہ بخوبی چلا۔ ہاں خاں بہادر اور رائے بہادر وغیرہ ہمارے زمانے میں ایجاد ہوئے لیکن وہ بھی ایجاد کر گئے۔ انگریزوں کی واپسی پر یہ ایجادیں اپنے مُریدوں کے ساتھ انگلستان آنے پر مُصِر تھیں لیکن انگریزوں نے اِس معاملے میں تھوڑی بے مروّتی بلکہ طوطا چشمی سے کام لیا۔ سروں یعنی سرداروں کے علاوہ کنگ آرتھر کے زمانے کی ایک مشہور شخصیت مرلن صاحب بھی تھے۔ یہ اُن کے دربار کے جادُوگر تھے اور اُلٹی مت دیتے تھے۔ اِسی زمانے سے یہ رواج ہے کہ ہر بادشاہ کے ساتھ ایک مرلن ضرور لگا رہتا ہے جو بادشاہ پر ایسا جادُو کرتا ہے کہ اُس کی آنکھیں بند ہو جاتی ہیں اور وہ جو کُچھ کرتا ہے آنکھیں بند کر کے کرتا ہے۔ حتّیٰ کہ قعرِ مذلّت میں، یا کسی اور گڑھے میں جاگرتا ہے۔ مثالیں بہت ہیں لیکن ہمارے قارئین خود تلاش کریں۔ آخر اُن کا بھی تو کُچھ فرض ہے۔

بادشاہی الفریڈِ اعظم کی

پڑھنا لاطینی، جلانا کُلچے، اور ایجاد کرنا لالٹین کا

گول میز والے کِنگ آرتھر کے بعد انگلستان میں دوسرا مشہور بادشاہ الفریڈ ہوا ہے۔ اِس کی میز کِس شکل کی تھی، یہ تاریخوں میں مذکور نہیں۔ اِسے الفریڈِ اعظم بھی کہتے ہیں۔ جس طرح سکندرِ اعظم۔ سکندرِ اعظم، اکبرِ اعظم کو اکبرِ اعظم اور جنرل اعظم خان کو۔۔۔ خیر اِن کا معاملہ دوسرا ہے۔ سیّد ہاشمی فرید آبادی مرحوم کو تحقیق

کا موقع ملا تو یہی بتاتے کہ الفریڈ اصل میں الفرید ہے اور یہ خاندان بنو اُمیّہ کا کوئی شہزادہ تھا جو شوقِ تبلیغ میں تلوار مارتا ہوا انگلستان جا نِکلا تھا۔ اتّفاق سے اِس بادشاہ کے شوقِ تبلیغ کا تاریخ میں ذکر ملتا بھی ہے جب اُس نے ڈینش سردار گوتھرم کی شورش کو رفع کیا اور وہ پکڑا آیا تو الفریڈ نے اُس کی گردن پر تلوار رکھ کر کہا کہ برضاو رغبت دینِ مسیحی کی حقانیت کا اقرار کرو ورنہ ابھی بھُٹا سا سر اُڑاتا ہوں۔ چنانچہ وہ صدق دِل سے بلا جبر و اکراہ مسیحی ہو گیا اور خداوندِ خُدا کی مناجات گانے لگا۔ اسے مزید پکّا کرنے کے لیے شاہ ممدوح نے بپتسمہ کے بہانے اُسے سمندر کے برفانی پانی میں غوطہ بھی دیا۔ بعد ازاں الفریڈ یعنی ہمارا شہزادہ الفرید اُموی اِسے مسلمان بھی ضرور کرتا جو عیسائیت کے بعد کا قدرتی مرحلہ ہے۔ کسی کو ایک ہلّے میں مسلمان نہیں بنالینا چاہیے ورنہ گرم سرد ہو جاتا ہے۔ اگر گوتھرم کی زندگی نے وفا کی ہوتی اور وہ بپتسمہ کی وجہ سے نمونیہ میں مُبتلا ہو کر قبل از وقت خُدا کی بادشاہت میں داخل نہ ہو گیا ہوتا۔ یاد رہے یہ ہمارے سیّد ہاشمی مرحوم ہی تھے جنھوں نے کراچی کے بارے میں اِس گُمان کی تردید کی تھی کہ اِسے کلاچی کے نام کے ایک مچھیرے نے اٹھارہویں صدی میں آباد کیا تھا۔ آپ نے فرمایا۔ بھلا مچھیرے بھی شہر بسایا کرتے ہیں؟ اِسے ضرور محمد بن قاسم کے ساتھ آنے والے قریشیوں نے آباد کیا ہو گا اور

قراشی نام رکھا ہو گا جو بگڑ کر کراچی ہو گیا۔ اتّفاق سے صدر ایّوب قریشیوں سے بہت گھبراتے تھے۔ انہیں اِس تحقیق کا معلوم ہوا تو اپنا پایۂ تخت کراچی سے اُٹھا کر راولپنڈی لے گئے جس کے معرب کیے جانے کا امکان بہت کم تھا۔

(۲)

الفریڈ کے زمانے میں لوگ تعلیم کے مُضِر اثرات سے واقف تھے لہٰذا بچّوں، خصوصاً شرفا اور روساء اور والیانِ مملکت کے بچّوں کو، اِس سے حتّی الوسع دور رکھا جاتا تھا۔ الفریڈ کے والد ماجد ِکنگ ایتھل وولف نے بھی اِس کی کما حقہ احتیاط کی۔ چنانچہ الفریڈ بارہ سال کی عمر تک خواندگی سے مامون اور محفوظ رہا۔ لیکن ہونی ہو کر رہتی ہے۔ اُس کی ماں دوسری قسم کی تھی۔ اُس نے ایک روز چاروں بھائیوں کو اِکٹھّا کر کے اُن کو کہانیوں کی ایک مصوّر قلمی کتاب پڑھ کر سُنائی اور کہا تُم چاروں میں سے جو پڑھنا سیکھنے کا ایک کتاب اُسے انعام میں ملے گی۔ باقی تین بھائی سمجھ دار تھے لیکن الفریڈ لالچ میں آ گیا۔ اُس نے صرف لاطینی زبان ہی نہ سیکھی بلکہ اپنی مادری زبان انگریزی بھی پڑھی۔ الفریڈ کے تین بھائیوں کا بعد میں کیا ہوا اِس کا ذکر انگریزی تاریخوں میں بہت آیا۔ لہٰذا قارئین کرام کو اپنے خاندانِ مُغلیہ کے کسی بھی بادشاہ

کے بھائیوں کا حال پڑھ لینا چاہیے۔

(۳)

الفریڈ نے اپنی زندگی میں بہت سی لڑائیاں لڑیں اور بہت سے شورہ پُشت باغیوں کی سرکوبی کی۔ یاد رہے کہ گھسّڑ کِسی نہ کِسی نام سے ہر مُلک میں ہوتے ہیں۔ جب سب دُشمن مطیع ہو گئے، کوئی نہ رہا جسے زِک نہ دے سکتا اور تیغ کے گھاٹ اُتار سکتا تو اُس نے لوگوں کو قلم کے گھاٹ اُتارنے کا منصوبہ بنایا اور لاطینی کی کُچھ آسان کتابیں لے کر اُن کا مُشکل مُشکل انگریزی میں ترجمہ کیا۔ لیکن اُسے پبلشر کوئی نہ ملا حالانکہ آج کا زمانہ ہوتا تو نہ صرف مقامی پبلشر بلکہ آکسفورڈ یونیورسٹی وپریس والے بھی دوڑے دوڑے آتے اور اِس کتاب کے افتتاحی جلسے نیشنل سنٹر میں ہوتے اور اِن کتابوں کا بہت سی زبانوں میں حتّٰی کہ واپسی لاطینی میں بھی ترجمہ کیا جاتا۔ کوئی پبلشر ملا بھی تو اُس نے عُذر کیا کہ جہاں پناہ ہم کتابیں کیسے چھاپیں۔ ابھی تو کیکسٹن نے چھاپہ خانہ ہی ایجاد نہیں کیا. کہتا ہے پندرہویں صدی کے آخر میں کروں گا۔ آپ چار صدیاں انتظار کرنا چاہیں تو مسوّدے چھوڑ جائیں۔ اِس میں بھی مصلحتِ خُداوندی تھی۔ چھاپہ خانہ ہوتا تو ساری رعایا کو ناحق یہ کتابیں پڑھنی پڑتیں۔

انگلستان میں اسکول بھی سب سے پہلے الفریڈ ہی نے قائم کیے۔ لیکن زندگی نے اِتنی مہلت نہ دی کہ انہیں نیشنلائز بھی کر سکتا۔

(۴)

الفریڈ کا سب سے بڑا کارنامہ جو کتابوں میں آیا ہے یہ ہے کہ اُس نے ایک بُڑھیا کے کیک جلا دیئے تھے۔ کیک تو کیا ہوں گے، روٹیاں یا کُلچے ہوں گے۔ ہوا یُوں کہ بادشاہت کے ابتدائی دِنوں میں دُشمنوں نے ایکا کر کے اُس کی افواج قاہرہ کو ڈنڈے مار مار کر بھگا دیا اور خُود اُس کی زبان کے درپے ہوئے۔ ہر چند کہ ہمارا ممدوح بہت نڈر اور بے خوف تھا تاہم چوٹ پیٹ کے ڈر سے بھیس بدل کر جنگل میں ایک دہقان کے جھونپڑے میں جا چھُپا۔ دہقان کی بُڑھیا نے اُسے دلاسا دیا اور کہا۔ لے بیٹے میں روٹیاں توّے پر ڈالتی ہوں تُو ذرا اِنہیں سینک دے۔ لیکن آنچ کا خیال رکھنا اور پلٹتے رہنا۔ اب پکانا ریندھنا کوئی بادشاہی تو ہے نہیں کہ تاج سر پر رکھ لیا اور لباسِ فاخرہ پہن کر تخت پر فروکش ہو گئے اور اُلٹے سیدھے حکم دینے لگے یا آرڈیننس نکالنے لگے۔ اِس کے لیے تجربہ اور آنچ کی پہچان چاہیئے۔ ہمارے بادشاہ سلامت اپنے خیالوں میں مگن بیٹھ رہے۔ مؤرّخوں کا کہنا ہے کہ رعایا کی فکر میں منہمک تھے

لیکن یہ دریافت نہیں ہو سکا کہ مؤرّخوں کو اِس کا کیسے عِلم ہوا۔ بہر حال روٹیاں جل گئیں اور اِس نیک بی بی نے اُسے بہت سخت سُست کہا کہ بڑا بادشاہ بنا پھِرتا ہے۔ کام کا نہ کاج کا، دُشمن اناج کا۔ اِس کے بعد سے یہی ڈگر بن گئی کہ جو بادشاہ آیا اُس نے رعایا کی روٹی ضرور خراب کی۔ یا تو جلا دی یا کچّی چھوڑ دی یا اُس میں کنکر ڈال دیئے یا پھر سیدھے سیدھے چھین کے اپنے مال خانے میں بھجوا دی کہ تُم لوگ اِسے کیا کرو گے۔ بھلا روٹی بھی کوئی کھانے کی چیز ہے۔ اُس کے کھانے سے نفخ ہوتا ہے۔ کیا ہمارے وطنِ عزیز میں پتھّروں کی کمی ہے۔ ایک ایک اُٹھا کر پیٹ پر باندھ لو۔ کم پڑ جائیں گے تو باہر سے منگا لیں گے۔

(۵)

الفریڈ نے دُشمنوں کی سرکوبی کر لی اور لاطینی کتابوں کو انگریزی میں ترجمہ کر لیا تو سوال پیدا ہوا کہ اب کیا کرے۔ چنانچہ خالی وقت کیسے بتائے۔ چنانچہ اُس نے لوگوں کے لیے مُنصفانہ قانون بنانے شروع کئے۔ اُس زمانے میں پارلیمنٹ وغیرہ کا ٹنٹا نہیں تھا۔ نہ لوگ مقدمے لے کر عدالتوں میں دوڑے جاتے تھے کہ فلاں قانون قانونی ہے، نہ بنیادی حقوق کا کھڑاگ تھا۔ جب بادشاہ کو سارے حقوق

حاصل ہیں تو رعایا کو فرداً فرداً حقوق لینے کی کیا ضرورت ہے۔ الفریڈ اعظم کا ایک کارنامہ یہ ہے کہ اُس نے چوروں اور ڈاکوؤں کا قلع قمع کیا۔ چنانچہ روایت ہے کہ لوگ سونا اُچھالتے چلے جاتے تھے۔ کوئی آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھنا تھا۔ کُچھ ایمانداری کی وجہ سے، کُچھ حکومت کے خوف سے۔ بعض لوگوں نے تو سونا اچھالنا اپنا کُل وقتی شُغل بھی بنا لیا تھا۔ بعد میں سونے کی قلّت ہو گئی تو لوگ یہ کام ٹوپیوں اور پگڑیوں سے لینے لگے۔ وہ بھی دوسروں کی ٹوپیوں اور پگڑیوں سے۔ الفریڈ نے وقت کو ناپنے کے لیے موم بتّیاں ایجاد کیں لیکن ہوا چلنے سے بعض اوقات بتّی جلد بجھ جاتی تھی اور وقت میں گڑبڑ ہو جاتی تھی۔ لہٰذا بادشاہ نے موم بتّیوں کے گرد کھڑکیاں لگا کر لالٹین ایجاد کی۔ سوچنے کی بات ہے کہ شاہ الفریڈ نہ ہوتا تو صدر ایّوب کے زمانے میں اپوزیشن کیا کرتی۔ اُسے نشستیں تو ایک طرف اِنتخابی نشان تک دستیاب نہ ہوتا۔ مشہور ہے کہ شاہ الفریڈ کی اپوزیشن نے بھی لالٹین کا نشان مانگا تھا لیکن شاہ نے اُس کو دھتا بتایا۔ تاریخوں میں آیا ہے کہ شاہ الفریڈِ اعظم کی تمنّا تھی کہ انگلستان خوش اور خوش حال رہے۔ لیکن انسان کی ہر خواہش تھوڑا پوری ہوتی ہے۔

(٦)

الفریڈ اعظم کو مذہب سے بہت شغف تھا۔ اُس نے جابجا خانقاہیں بنوائیں تاکہ لوگ وہاں جائیں اور راہب بن کر اپنی زندگی خُدا کی بندگی میں بسر کریں۔ لیکن انگریزوں کا رُحجان اُس زمانے میں بھی دُکانداری کی طرف زیادہ اور رہبانیت کی طرف کم تھا۔ لہٰذا الفریڈ کو فرانس سے راہب منگا کہ اِن خانقاہوں میں بسانے پڑے۔ ہمارے ہاں بھی ایمان کی حرارت والے اپنی نیک اور بعض اوقات غیر نیک کمائی سے مسجدیں تو بنا دیتے ہیں لیکن نمازیوں کا بندوبست نہیں کر پاتے۔ چنانچہ بعض علاقوں میں ایک ایک نمازی کے حصّے میں تین تین مسجدیں آجاتی ہیں۔

(٧)

الفریڈِ اعظم نے ایک نامعلوم مرض سے ٩٠١ء میں انتقال کیا۔ ابھی میڈیکل سائنس نے اتنی ترقّی نہ کی تھی ورنہ اُس کے اتنے ٹیسٹ ہوتے، اتنے ایکس رے ہوتے، اُسے مختلف ڈاکٹروں کے نُسخوں پر اِتنی جنرک اور غیر جنرک دوائیں اُسے کھانی پڑتیں کہ دسویں صدی میں قدم رکھنے کی نوبت نہ آتی۔ نویں صدی کے آخر ہی میں علاج کی تاب نہ لاکر دُنیا سے رُخصت ہو گیا ہوتا۔ لوگوں کا مرنا جینا نوشتۂ

قسمت کی بجائے نوشتۂ ڈاکٹر ہر مُنحصر ہو جانا بہت بعد کی بات ہے۔

اُٹھ گیاناوک فگن، مارے گا دِل پر تیر کون

ابراہیم جلیس سے ہماری کئی نسبتیں تھیں، کئی رشتے تھے۔ بہت پرانے اور بہت محکم۔ وہ ہمارا ہم دم تھا، ہمارے ہر دُکھ سُکھ میں شریک، ہمدرد تھا اور ہم جلیس تھا۔ وہ یُوں کہ گھر اُس کا ہمارے محلّے میں پڑتا تھا اور دفتر اُس کا ہمارے دفتر کے بالمقابل کہ کھڑکی کھول کر ہم ایک دوسرے کو آواز نہ دے سکیں تو صورت ضرور دِکھا سکتے تھے یا یہ ہوتا تھا کہ دوپہر کو ٹہلنے نکلے تو اُس کے ہاں جھانک آئے۔ ورنہ ٹیلی فون تو ہے ہی۔ سناؤ سردار جی کی حال ہے۔ سردار انشا سنگھ جی، وہ بڑے زنّاٹے کی پنجابی

بولتے تھے۔ اور اب سے نہیں، ۱۹۴۸،۱۹۴۷ سے بولتے آئے تھے۔ البتّہ چند منٹ بعد اُن کو دونوں ہاتھ رکھ کر اپنا جبڑا ضرور سیدھا کرنا پڑتا تھا۔ ہم تینوں بھائیوں کے متعلّق کہا کہتے تھے کہ یہ لوگ سِکھ ہیں لیکن اِن میں صرف ایک ایسا وضع دار ہے جو اپنے نام کے ساتھ اب تک سردار لکھتا ہے۔ اشارہ ہمارے لاہور والے بھائی کی طرف تھا، جس کا نام تو سردار محمود ہے مگر جلیس اُسے سردار محمود سنگھ کہتے تھے۔ ہمارے بھتیجے بابر کے ساتھ انہوں نے اور نسبت نکالی تھی۔ اُسے اپنا تاریخی حریف کہتے تھے۔ اسے رُقعہ بھیجتے ہوئے اپنا نام ابراہیم (لودھی) لکھتے تھے۔

بہت دِن پہلے کی بات ہے، دوسری جنگِ عظیم کے آخری دِنوں کی جب ہم لُدھیانے میں ساحر لدھیانوی کے چوبارے میں محفل جمایا کرتے تھے کہ ابراہیم جلیس کا نام ہم نے پڑھا اور سُنا۔ پڑھا تو ادبی دُنیا کے کسی پرچے ہیں۔ سُنا یُوں کہ ساحر سے اُن کی خط و کتابت تھی۔ بڑے لمبے لمبے خط آتے تھے جن میں مصائب کا بیان ہوتا تھا کہ تیسرا فاقہ ہے۔ دُنیا آنکھوں میں اندھیر ہے۔ چھت سے رسّی باندھ رکھّی ہے، ابھی خط پوسٹ کر کے اُس کا پھندا گلے میں ڈال لوں گا۔ اِدھر سے ساحر لدھیانوی بھی پیتا بھرا خط لکھتے تھے جس میں بدحالی کے بیان میں باری لے جانے کی کوشش کرتے تھے۔ دونوں خواہ مخواہ بے روزگار گریجویٹوں کا روپ دھارا کرتے

تھے حالانکہ فی الواقع دونوں کھاتے پیتے فارغ البال گھرانوں سے تعلّق رکھتے تھے۔ بلکہ ہم لوگوں سے مُقابلہ کیا جائے تو چھوٹے موٹے رئیس۔ دونوں انقلابی بھی تھے۔ چنانچہ جلیس کے ہاں بیٹی ہوئی تو اُس نے اُس کا نام روس کی سرفروش دوشیزہ کے نام پر زویا رکھّا۔ انہی دِنوں ہم نے بھی لکھنا شروع کیا اور جلیس حیدر آباد دکن کے کسی ماہنامے کے ایڈیٹر ہو گئے اور اب اُن کی ہم سے براہِ راست بھی خط و کتابت شروع ہو گئی۔ غائبانہ ربط ضبط بڑھا اور وہ سقوطِ حیدر آباد کے بعد لاہور آئے تو ہمارے ہی غریب خانے پر قیام کیا جو ڈیڑھ کوٹھڑی کا گھر تھا۔ ہم نے سامنے کے برآمدے پر پردہ ڈال کر اپنے لیے کمرہ بنا رکھا تھا جس میں پھنس پھنسا کر دو چارپائیاں آتی تھیں۔ اِن دونوں کا احوال انہوں نے اپنی کتاب ”دو مُلک ایک کہانی“ میں لکھا ہے۔ ہمارے چھوٹے بھائی محمود ریاض اُن کے لیے سستے سے سستے سگریٹ تلاش کر کے لاتے تھے۔ اور اِس خدمت کا معاوضہ یُوں وصول کرتے تھے کہ افسانے لکھتے تھے اور زبردستی اُن کو سناتے تھے۔ جلیس کا بیان ہے کہ ایک روز تو میں سائیکل پر بیٹھ کر فرار ہو گیا لیکن افسانے کا ربط نہ ٹوٹا۔ کیونکہ موصوف اُچک کر سائیکل کے کیریر پر سوار ہو گئے تھے۔ جلیس کی گفتگو میں جھوٹ اور سچ کو الگ الگ کرنا آسان نہ تھا۔ کبھی خالص سچ بولنا ہو تو اُن کو بڑی کاوش کرنی پڑتی تھی اور کہتے ہیں کہ بعد میں ضمیر

کی حالت بھی سُننی پڑتی ہے۔ بعضوں کا تکیہ کلام ہوتا ہے، خُدا جھوٹ نہ بُلوائے۔ یہ فرمایا کرتے تھے خُدا سچ نہ بُلوائے۔ سبھی جانتے ہیں کہ یہ اُن کے مزاح کا ایک بے ضرر خاصہ تھا۔ اُن کی زندگی لطیفے پیدا کرتے گُزری، تحریر سے بھی زیادہ تقریریں عام زندگی میں، گھر میں، محفل میں۔ اگر کسی کے لیے باغ و بہار کا لفظ استعمال کیا جا سکتا ہے تو وہ میاں جلیس تھے۔

اب تو ایک مُدّت سے وہ خود اپنے بیان کے مطابق ادب کے کوچے سے باہر تھے۔ کالم نگاری اور صحافت ہی اُن کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ لیکن اُن کی اُٹھان بحیثیت ایک طباع افسانہ نگار اور مزاح نگار کے بڑی شاندار تھی۔ اور اُن کے مدّاحوں کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ اُن کی طبیعت کی شوخی کے لئے اُن کی بعض کتابوں کے نام دیکھنا کافی ہیں۔ تکونا دیس۔ چالیس کروڑ۔ بھکاری۔ کالا چور وغیرہ۔ اُن کے کالموں کی بھی جو وہ جنگ اور انجام میں لکھتے تھے، بڑی دھوم تھی۔ اُن کا اندازِ فکر ہمیشہ سے ترقّی پسندانہ تھا اور اِس کے لیے انہوں نے لاکھوں کے بول بھی سہے۔ حتّٰی کہ قید و بند کی صعُوبتوں سے بھی گُزرے۔ ایک بار اپنے ایک مضمون کی بنا پر جس کا عنوان "پبلک سیفٹی ریزر" تھا۔ اُن کی تحریریں نکتہ آفرینی کے ساتھ ساتھ حکایت ضرور ہوتی تھی۔ لہٰذا کبھی وہ اپنا مضمون پڑھتے تھے تو سماں باندھ دیتے تھے اور بے پناہ داد

وصول کرتے تھے۔ ہم نے انہیں ہر موقع پر یہ مشورہ دیا کہ کالم نگاری سے کام رکھنا، ایڈیٹری کبھی نہ کرنا، یہ بُرا جنجال ہے۔ اِسے کبھی انہوں نے مانا کبھی نہ مانا۔ نہ ماننے کا نتیجہ ہمیشہ افسوسناک ہوا لیکن اتنا بھی افسوسناک ہو گا۔ یہ کسی کو خیال نہ تھا۔
ع

گلی ہم نے کہی تھی تم تو دُنیا چھوڑے جاتے ہو

جلیس ظالم نے ہمارے پردیس سے واپس آنے کا بھی انتظار نہ کیا۔ ع

تُم کون سے ایسے تھے کھرے

داد و سند کے چند برس ہوئے انہوں نے یک لخت سگریٹ پینا چھوڑ دیا تھا۔ تیس پینتیس برس کی عادت یک لخت ترک کر دی کیونکہ ڈاکٹروں نے اُن کے گلے کی خراش دیکھ کر اندیشہ ظاہر کیا تھا کہ یہ گلے کا کینسر بھی بن سکتا ہے۔ اِس کی احتیاط تو انہوں نے کر لی لیکن موت کے اتنے سارے چور دروازے ہیں، سب پر پہرہ نہ بِٹھا سکے۔ پار سال ان کے دِل نے اُن سے بے وفائی کی۔ ہسپتال میں رہے جس کی روداد میں اُن کا مضمون ہے رات تھوڑی ہے کہانی لمبی، خُدا کا فضل ہوا، پونچال واپس آئے، اور اب بظاہر ٹھیک ٹھاک تھے۔ اِس مہینے کے شروع میں لندن ایک دوست

کو خط لکھا جس میں یہاں آنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ لکھا کہ سارے بچّے جوان اور برسرِ روز گار ہیں، صرف دو لڑکیوں کی شادیاں باقی ہیں۔ وہ بھی انشاء اللہ دسمبر تک تکمیل پا جائیں گی۔ دسمبر میں دِن ہی کتنے رہ گئے تھے۔ دو مہینے، ظالم موت کے فرشتے نے اِتنی بھی مہلت نہ دی۔ بچیاں باہُنر اور سگھّڑ ہیں۔ آخر اپنے اپنے گھر کی ہو جائیں گی۔ لیکن اُن کے اِس بچّے کی زندگی کا خلا کون پورا کرے گا جو بچپن میں سر پر چوٹ آجانے کے بعد سے دماغی طور پر معذور ہے۔ جلیس نے اُس کے علاج کے لیے کیا کیا کوشش نہیں کی۔ عمر میں وہ جوان ہے لیکن باتیں پانچ سالہ بچّے کی سی کرتا ہے۔ باپ سے اُس کی عجب طرح کی دوستی تھی اور باپ کو بھی اُس سے عجب طرح کی بے تکلّفی تھی۔ دونوں گھنٹوں باتیں کرتے تھے۔ جلیس اُس کا ذکر کرتے تھے تو اداس ہو جاتے تھے۔ کئی ہزار میل دور بیٹھے تصوّر میں اُس کا گھر کا نقشہ باندھنے کی کوشش کرتا ہوں جو کرائے کا گھر تھا۔ ایک دوسرے گھر کے پچھواڑے میں واقع تھا۔ پھاٹک۔ اِس کے آگے ایک تنگ گُزر گاہ۔ اِس میں دو موٹر کھڑی رہتی تھی جس کا سب سے زیادہ مذاق وہ خود اُڑاتے تھے۔ اپنی بیگم سے بھی اُن کے عجب طرح کی انسیت تھی جو سلیقہ مندی جلیس کے رہن سہن اور پوشش میں تھی وہی گھر اور دفتر میں بھی جھلکتی تھی۔ اخبار یا کتاب پڑھتے تھے تو اُس میں نشان لگاتے

تھے، تراشے رکھتے تھے، اور اُن کا ایسا با موقع استعمال کرتے تھے کہ حیرت ہوتی تھی۔ اُن کی زندگی بھرپور تھی۔ حیدر آباد کی زندگی، بمبئی کی زندگی، لاہور اور کراچی کی زندگی۔ دوسرے پہلو سے دیکھتے تو اُن کی ادبی زندگی، صحافتی زندگی، فلمی زندگی اور سیاسی زندگی۔ اِن سب پر اُن کی اپنی زندگی کی چھاپ۔ شگفتہ اور قہقہہ آفریں ہونے کے ساتھ ساتھ سنجیدہ اور درد مند۔ لیکن رات تھوڑی ہے، کہانی لمبی۔ نہ جلیس اِسے اِس عنوان کے تحت مکمّل کر سکے، نہ ہمارے اِس مضمون میں سما سکتی ہے۔ ادیب ابراہیم جلیس کا نام تو پائندہ رہے گا لیکن اپنے ابراہیم جلیس کو، اپنے ناوکِ فگن کو کہاں ڈھونڈیں۔ کہاں جا کر آواز دیں۔ اے خُوش گُفتار توُ کیسے یکایک چُپ ہو گیا۔ اے سیماب وش تُجھے کیسے قرار آ گیا۔

ذکر سُلطان بحر و بر کنگ کینوٹ کا

سچ مُچ سمندر کی لہروں کو حکم دینے لگا

الفریڈ اعظم کا ذکر تمام ہوا۔ اے در بقاوہ شاہ روئی باز۔ بعد کے بادشاہوں کا نان بائی کے کسب سے براہِ راست تعلّق نہ رہا بلکہ یہ ہونے لگا کہ پارلیمنٹ والے پکاتے تھے یا پکی پکائی روٹی کے پلانٹ میں لگواتے تھے اور چوگا بکنگھم میں بھجواتے تھے۔ یہ لوگ کُچھ کھاتے تھے کُچھ اپنے ٹوڈی بچّوں کو کھِلواتے تھے۔ ہندوستان کے بادشاہوں کے

باب میں بھی روٹی کا ذکر ملتا ہے۔ خصوصاً بیسن کی روٹی کا کہ بادشاہ کے ہاں بچ رہے یا باسی ہو جائے تو پھینکنے کی بجائے شاعرِ دربار کو بھیجتے تھے۔ وہ روٹی تو غالباً نہ کھاتا تھا، ثقیل ہوتی ہے۔ شوربے کے پیالے میں پھلکا بھگو کر اپنا کام چلاتا تھا لیکن طوعاً و کرہاً قصیدہ اُسے ضرور لکھنا پڑتا تھا۔ وہ بادشاہ بھی گئے۔ وہ شاعر بھی گئے۔ وہ روٹیاں بھی گئیں۔ لیکن قصیدے اب تک باقی ہیں۔ اے صاحبو حسنِ اتّفاق سے اب جس بادشاہ کا ذکر ہم کرنے والے ہیں اُس کا تعلّق مدح و قصیدہ سے تھا۔ یہ شاہ کینوٹ کے نام سے مشہور ہوا۔ اِس کے اخباری سرکاری درباری اِس کی خوشامد بڑے خضوع و خشوع سے کرتے تھے۔ لیکن روٹی والے اور قصیدے والے اِن دو بادشاہوں کے درمیان بھی کُچھ بادشاہ آئے جن کا ذکر کتابوں میں اور تصویریں سِکّوں پر ملتی ہیں۔ کُچھ گول آنکھوں والے، کُچھ چپٹی ناک والے۔ کُچھ داہنی طرف کو دیکھ رہے ہیں۔ کُچھ بائیں طرف کو دیکھ رہے ہیں۔ جانے کیا دیکھ رہے ہیں۔ اِس زمانے کے انگلستان میں کوئی چیز دیکھنے کی نہیں تو اِس زمانے میں کہاں ہو گی اور سیاست میں دائیں بائیں کا رحجان بھی نہ چلا تھا۔ اِس دور کو بچگانہ بادشاہوں کا دور بھی کہتے ہیں۔ اُن میں سے بعض تھے بھی بارہ بارہ چودہ چودہ برس کے۔ بادشاہ گروں کے ہاتھوں میں بہار جانفزا دِکھا کر کوئی یہاں ِگرا کوئی وہاں ِگرا۔ اِن لوگوں سے بعض بچگانہ حرکتیں بھی

ہوئیں۔ لیکن اِتنی بچگانہ بھی نہیں جتنی بڑی عُمر کے عاقل بالغ مدبّر ولایت پاس بادشاہوں سے سر زد ہوتی ہیں۔ اِن میں سے اکثر کے نام ایڈ سے شروع ہوتے تھے۔ مثلاً ایڈ دی ایڈز، ایڈمنڈ، ایڈورڈ، ایڈ دی، ایڈ گر، ایڈ شہید وغیرہ۔ اُردُو میں اِن کے نام پڑھنے سے شُبہ ہو سکتا ہے کہ یہ امریکن ایڈ میں آئے ہوں گے۔ تبھی اِن کو اتنا فروغ نہیں ہوا لیکن اتّفاق سے امریکن ایڈ ابھی شروع نہ ہوئی بلکہ امریکہ بھی ابھی شروع نہ ہوا تھا اور کولمبس کے شروع ہونے میں بھی کُچھ وقت تھا۔ یہ نام AID سے نہیں ED سے شروع ہوتے ہیں۔ اِن میں سے آخری بادشاہ ایڈمنڈ اور ہمارے ممدوح شاہ کینوٹ کے درمیان کہ وطن مالوف اِن کا ڈنمارک تھا اور مہاجر کہلانے کے مستحق تھے۔ پہلے تو لڑائی ہوئی۔ پھر جنیوا کانفرنس ہوئی اور سلطنت کی تقسیم ہوئی کہ شمال میں کینوٹ رہے۔ جنوب میں ایڈمنڈ دندنائے۔ لیکن پھر دیکھتے دیکھتے لوگوں نے دیکھا کر کینوٹ سارے مُلک کا بادشاہ بن گیا۔ کیونکہ ایڈمنڈ دوماہ کے اندر قضائے الہیٰ سے فوت ہو گیا۔ کُچھ لوگ کہتے ہیں کہ فوت کر دیا گیا لیکن ایسی بدگمانی بدباطن مؤرخین کہتے ہیں۔ جہانگیر کے متعلّق بھی لکھا کہ اُس نے شیر افگن کو مروایا، نور جہاں کے راستے سے ہٹایا۔ وہ برضا و رغبت نہیں مرا۔ جہانگیر ایسا ظالم اور کینہ پرور ہوتا تو زنجیرِ عدل میں اتنا بڑا گھنٹہ کیوں لگواتا اور اُسے اتنے زور شور

سے کیوں بجواتا کہ اُس کے عہد میں سوائے انصاف اور تھوڑی سی زن مریدی کے اور کسی چیز کا ذکر ہم نہیں پاتے۔ وہ نیک بی بی نور جہاں جہاں تک ہمارا خیال ہے خود ہی کُچھ کبوتر اُڑانے اور کُچھ کبوتر کھانے کے شوق میں اِدھر چلی آئی۔ شیر افگن سپاہی زادے کے ہاں تو کئی کئی دِن ہنڈیا بھی نہ پکتی ہو گی۔

شاہ کینوٹ کے رشتہ دار اچھّے نہ تھے۔ اُس کی جانشینی کے باب میں بُرے بُرے خیالات دِل میں لاتے ہوں گے۔ لہٰذا اُس نے اُن کو چُن چُن کر مروانا شروع کیا۔ منادی کروادی کہ جو شخص میرے کسی عزیز یعنی دُشمن کا سر لائے گا وہ انعام پائے گا اور میرا بھائی کہلائے گا۔ چنانچہ دیکھتے دیکھتے مُلک میں اخوّت کا دور دورہ ہو گیا۔ اتنے بھائی جمع ہو گئے کہ سنبھالنے مُشکل ہو گئے۔ آخر یہ رسم موقوف کرنی پڑی۔ اِس اثنا میں رشتہ داروں کی معقول چھانٹی بھی ہو چکی تھی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ بادشاہ کے ضمیر جعفری نے اُسے ملامت کی کہ تُو نے ستم کیا۔ تو بادشاہ پادریوں کے مشورے سے روم کی زیارت پر روانہ ہو گیا اور راستے میں دریا دلی سے خیرات کرتا گیا۔ یہ خیرات کے پیسے اُس نے چلنے سے پہلے انگلستان کی رعایا سے جمع کیے تھے۔ اور بعبورِ دریائے شور خیرات کرنے کا مطلب یہ ہے کہ فارن ایکس چینج میں تھے۔ ویسے واللہ عالم بالصواب۔

انصاف سے دیکھا جائے تو بادشاہ کینوٹ کے درباری ایسے خوشامدی بھی نہ تھے جیسے مشہور کر دیے گئے۔ یہ بھی نہ ہو تو حاکمِ وقت کی تعریف کرنا ہمارے نزدیک خوشامد نہیں بلکہ ایک تعمیری اندازِ فکر ہے۔ ایک طرح کی حُبّ الوطنی اور بیدار مغزی ہے۔ جو لوگ بادشاہ وقت کو مبارکبادیں دیتے ہیں، واہ واہ سبحان اللہ کہتے ہیں۔ اُس کے کارناموں پر خاص نمبر نکالتے ہیں۔ خدانخواستہ کسی لالچ یا بے اصولی کے باعث ایسا نہیں کرتے۔ اِن کی نیّت نیک ہی ہوتی ہے۔ کم از کم اپنے بارے میں نیک ہی ہوتی ہے۔ بادشاہ کے بارے میں کوئی عیب ہو بھی تو کلام الملوک ملک الکلام کی طرح قابلِ عفو و درگذر ہوتا ہے۔ اُس کی چھیچھالیدر میں جلدی مناسب نہیں۔ اُس کے تخت سے اُترنے کا انتظار کیا جا سکتا ہے۔ حق بات دیر سے یا بعد از وقت بھی کہی جائے تو آخر حق بات ہوتی ہے۔ وقت پر یعنی قبل از وقت اِس کے اظہار سے چند در چند قباحتوں کا احتمال رہتا ہے جن سے بچنا چاہیے۔

پس یہ زیادتی تھی کہ جب شاہ کینوٹ کے درباریوں نے اُسے باور کرایا کہ اے بادشاہ تیرا حکم خشکی پر بھی چلتا ہے اور سمندر پر بھی چلتا ہے تو وہ واقعی سمندر کنارے کُرسی بچھا کر بیٹھ گیا اور طوفانی لہروں کو حکم دینے لگا کہ پیچھے ہٹو۔ میں بڑے دبدبے والا بادشاہ ہوں۔ ارے کوئی ہے۔ بند کرو اِن کو۔ ایسی باتیں تو استعارۃً کہی

جاتی ہیں، اخلاقاً کہی جاتی ہیں۔ بادشاہ کینوٹ کو اِس کے ڈانٹنے کے باوجود سمندر کی لہروں نے بھگو دیا۔ بلکہ قریب قریب ڈبو دیا تو وہ کُرسی اُٹھوا کر ساحل کی طرف بھاگا اور جا کر اپنا پاجامہ بدلا۔ ایک آدھ روز کی بات ٹھیک ہے، روز روز پاجامے بھی نہیں بدلے جاسکتے۔ ختم ہو جاتے ہیں اور آدمی خواہ بادشاہ بھی ہو، آخر میں ننگا ہو جاتا ہے۔ پاجامے بار بار بدلنے کی بجائے بادشاہ اپنے درباری بدل دے تو زیادہ مناسب رہتا ہے۔ لیکن بادشاہ لوگ ایسا نہیں کرتے، کم از کم ہم نے اب تک نہیں پڑھا۔

قینچی ہی تو ہے

اخبار جہاں میں ایک مراسلہ لکھا کہ وطنِ عزیز میں ایک سرجن نے ایک ملین کا آپریشن کیا اور وہ صاحب تندرست ہو کر ٹانکے لگوا کر گھر چلے گئے۔ لیکن تھوڑے دنوں بعد پیٹ میں درد کی شکایت شروع کر دی۔ عزیزوں نے سوڈا واٹر پلوایا۔ چُورن کھِلوایا۔ جُلاب دیا لیکن شکایت رفع نہ ہوئی۔ اُسی عطّار سے یعنی اُس ڈاکٹر سے رجوع کیا تو اُس نے کہا بابا میرا کام آپریشن کرنا ہے۔ پیٹ کا درد دُور کرنا نہیں ہے۔ معلُوم ہوتا ہے مریض کو وہم ہے۔ اور اِس کا علاج جدید ڈاکٹری میں کیا قدیم طِب

تک میں نہیں ہے۔ اِس کے آگے کی حکیم لُقمان تک جو زنانہ، مردانہ، پیچیدہ در پیچیدہ دیرینہ و غیر دیرینہ امراض کے مریضوں کا آخری سہارا تھا، لاچار تھے۔ عزیزوں کے پُرزور اِصرار پر ایکسرے کرایا گیا تو آنتوں کے درمیان ایک قینچی نظر آئی۔ آپریشن کرنے والے ڈاکٹر نے کہا بابا یہ بھی تمہارا واہمہ ہے۔ پیٹ کے اندر بعض ہڈّیاں قینچی کی شکل کی ہوتی ہیں لیکن آج کل زمانہ ایسا آن لگا ہے کہ لوگ ڈاکٹر کی زبان کا کم، ایکسرے کا زیادہ اعتبار کرتے ہیں۔ حالانکہ ڈاکٹر صاحب اپنے فن کے ماہر ہیں جس کی شہادت اُن کے مریض دیں گے جن میں سے آدھے اِس دُنیا میں اور آدھے اس دُنیا میں ہیں۔ آخر ایک دوسرے سرجن سے آپریشن کرایا اور اِسے اتّفاق کہتے بلکہ حُسنِ اتّفاق کہیے کہ قینچی نکل بھی آئی۔

اتنی سی بات تھی جسے لوگوں نے یعنی مریض کے لواحقین نے جو بصورتِ دیگر اِن کے پسماندگان کہلائے، افسانہ کر دیا۔ آخر قینچی ہی تھی کلہاڑا تو نہیں تھا۔ اور یہ پہلے ڈاکٹر کی دیانت اور سیر چشمی نہیں تو کیا ہے کہ انہوں نے قینچی دیکھ کر کہا کہ یہ میری نہیں، مریض چاہے تو اپنے پاس رکھ سکتا ہے۔ اگر بالفرض یہ اِس ڈاکٹر کی تھی تو یہ دیکھنا چاہیے کہ اُس نے مریض کے پیٹ میں کُچھ ڈالا ہی، کُچھ نکالا تو نہیں۔ اگر مریض کے پیٹ میں پہلے ہی سے قینچی ہوتی اور ڈاکٹر صاحب اُسے نکال کر اپنی جیب

میں ڈال لیتے تو البتّہ اعتراض کی بات ہوتی۔ مریض کو تو خوش ہونا چاہیے کہ اُسے بیٹھے بٹھائے اتنی اچھّی چیز مل گئی۔ ہم نے پچھلے دنوں آپریشن کرایا۔ اِس میں سے تو کُچھ نہیں نکلا جو ہمارے کام آسکتا۔ بہر حال یہ اپنی اپنی قسمت ہے۔ قینچی کے بڑے فائدے ہیں۔ اِس سے بال کاٹے جاسکتے ہیں مُونچھیں تراشی جاسکتی ہیں۔ کان کاٹے جاسکتے ہیں۔ ناخن کاٹے جاسکتے ہیں۔ لوگوں کے کپڑے کاٹے جاسکتے ہیں۔ پورے کپڑے کاٹنے پسند نہ ہوں تو جیبیں کاٹی جاسکتی ہیں اور بیروزگاری کا مسئلہ حل کیا جا سکتا ہے۔ سگریٹ کے تعلّق کہا جاتا ہے کہ انسان کے رشتۂ حیات کو قطع کرنے کے لیے مجرّب اور آزمودہ ہے۔ اِس لیے ایک سگریٹ والے نے اپنے سگریٹ کا نام ہی قینچی رکھا۔ مشہور رومن فاتح جولیس سیزر کے نام سے شُبہ ہوتا ہے کہ اُن کی فتوحات شمشیر کی بجائے سیزر یعنی قینچی کی مرہونِ منّت ہوں گی۔ آدمی تھوڑا سا لکھا پڑھا ہو (اس میں زور تھوڑا سا پر بھی ہے اور لکھا پڑھا پر بھی) تو نامی گرامی جرنلسٹ بن سکتا ہے۔ ایڈیٹر ہو سکتا ہے۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ ایڈیٹر یا جرنلسٹ یا کالم نگار بننے کے لیے فی زمانہ قلم اتنا کام نہیں آتا جتنا قینچی کام آتی ہے۔ اِس وقت بھی ہم نے قینچی ہی تلاش کی تھی۔ وہ ملی نہیں تو مجبوراً قلم سے کام لے رہے ہیں۔ بعض اخبار تو پورے کے پورے قینچی سے مرتّب ہوتے ہیں اور اصولاً

اِن پر ایڈیٹر کے طور پر کسی میاں مقراض الدّین کی بجائے سیدھا سیدھا قینچی کا نام آنا چاہیے۔ ایک بزرگ نے تو اپنے اخبار کا نام ہفت روزہ قینچی تجویز کیا تھا۔ حضرت اسلام سلمانی بی اے نے اُن کو مبارک باد کا تار بھیجا جس میں اپنے تعاون کا یقین دلایا گیا تھا تو اُن کو یہ نام بدلنا پڑا کہ کہیں لوگ اِس کو بار برداری کا اخبار ہی نہ سمجھ لیں۔ کیونکہ فی الحال ہمارے معاشرے میں بال کاٹنے والوں کے مُقابلے بال کٹوانے والوں کی اکثریت ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ جو لوگ بال کٹوانے سے گھبراتے ہیں وہ ہفت روزہ قینچی کی سرپرستی کیوں کریں گے۔

قینچی سے اخبار مرتّب کرنے میں فائدہ یہ ہے کہ مضمون نویسوں کی خوشامدیں نہیں کرنی پڑتیں اور کاتبوں کے نخرے نہیں اُٹھانے پڑتے۔ تراشہ نیچے رکھا اور اُس کی فلم نکالی اور جوڑ دی۔ اسٹاف کی بھی ضرورت نہیں۔ نہ اسٹاف ہو نہ تنخواہ مانگے۔ نہ ہڑتال کرے۔ نہ مُلکی معیشت کو نقصان پُہنچے۔

حوالہ دینے کا ہمارے مُلک میں رواج نہیں حالانکہ دوسرے مُلکوں میں حوالہ دینے والوں کو حوالۂ پولیس تک کیا جاسکتا ہے۔ بہت مہربانی کی تو خبر یا فیچر کے شروع یا آخر بریکٹ میں لکھ دیا۔ (ا۔ج) یہ ارشد جمیل یا اللہ جوایا بھی ہو سکتا ہے جس نے اخبار ہذٰا کے نامہ نگار کے طور پر محنتِ شاقہ سے خبر حاصل کی یا فیچر مرتّب کیا اور تحقیق

کریں تو اخبارِ جنگ بھی جہاں سے وہ تحریر کاٹی گئی۔ ایسا بھی ہوا کہ کہیں سے کوئی غزل تراشی گئی۔ لیکن قینچی ہی تو ہے نہ سنگ و خشت۔ شاعر کا نام کٹ کر اصل اخبار یا رسالے ہی میں رہ گیا۔ اب ٹوکری میں سے ردّی کُترنیں کون اُٹھائے اور دیکھے۔ ایڈیٹر نے از راہِ ایثار اپنا ہی نام دے دیا۔ یُوں بھی لوگوں کو تو اشعار سے محفوظ ہونے سے مطلب ہے، بقول شخصے نام میں کیا دھرا ہے۔

اِس معاملے کا ایک قانونی پہلو بھی ہے۔ اِس مرض سے دریافت کرنا چاہیے کہ اُس نے اتنے دِن یہ قینچی کیوں اپنے پیٹ میں چھُپائے رکھی۔ یہ ہسپتال کی جائیداد تھی، مریض کے باوا کا مال نہیں تھا۔ اسپتال میں اِس کی کسی بھی وقت ضرورت پڑ سکتی ہے۔ کسی نرس کو اپنے ناخن کاٹتے ہوں، بھنویں تراشنی ہوں، کسی ڈاکٹر کو اخبار سے معمّہ کاٹنا ہو کہ آپریشن بھی کرتے جائیں دِل بہلانے کے لیے غور و فکر بھی کرتے جائیں کہ ذیل کے فقرے میں

اکبر کے زمانے میں۔۔۔ اور بکری ایک گھاٹ پانی پیتے تھے

خالی جگہ میں لفظ شیر رکھنا زیادہ مناسب ہے یا بھیڑ زیادہ موزوں رہے گا جو محاورے کے خلاف لیکن عقل کے زیادہ قریب ہے۔ بہر حال اُس مریض کے خلاف پرچہ

کٹنا چاہیے اور اِس قینچی سے کٹنا چاہیے تا کہ آئندہ کوئی مریض، چھُری، چاقو، قینچی، بستر کی چادر، تکیہ، ڈاکٹر صاحب کی عینک، اسٹیتھو سکوپ، نرس کی نیل پالش، لپ اسٹک، وارڈ بوائے کی نسوار کی ڈِبیہ، یا فلمی گانوں کی کاپی اُٹھا کر پیٹ میں نہ رکھ لے۔ آج کل کے مریضوں کا کُچھ اعتبار نہیں۔ ایک مریض کے پیٹ میں سے تو آپریشن کرنے کے بعد داڑھی نکلی جو تحقیق پر معلوم ہوا کہ اُن کی اپنی نہیں تھی۔ اُس ڈاکٹر کی تھی جنہوں نے شروع میں اُن کا آپریشن کیا تھا۔ بے چارے بہت دِن لوگوں سے مُنہ چھُپائے پھِرتے رہے۔

بادشاہت کی تلاش میں

فی زمانہ حکومتوں کے بدلنے کے دو طریقے رائج اور مقبول ہیں۔ ایک بیلٹ یعنی الیکشن کا۔ دوسرا بُلٹ یعنی گولی کا۔ ویسے اب دونوں میں چنداں فرق نہیں رہا کیونکہ الیکشن میں بھی بیلٹ کے ساتھ ساتھ بلکہ بیلٹ سے زیادہ بُلٹ کا استعمال ہونے لگا ہے اور زیادہ مؤثر اور کامیاب پایا گیا ہے۔ ہم ذاتی طور پر الیکشن کے حق میں نہیں، یہ خُون خرابے کی چیز ہے جسے ہم نے مغرب کی اندھی تقلید میں اختیار کیا ہے۔ ہمارے بہترین بادشاہوں میں سے جِن کا نام زرّیں حروف سے لکھتے لکھتے ہماری

دواتیں خُشک ہو گئی ہیں اور مُلک کے سونے کے ذخائر میں معتدبہ کمی واقع ہو گئی ہے۔ اکبر، جہانگیر، شاہ جہاں وغیرہ۔ ان میں سے کون الیکشنوں کے ذریعہ برسرِ اقتدار آیا۔ عوام کی اکثریت کی رائے کوئی سند بھی نہیں۔ لوگوں کا بس چلتا تو بادشاہ غازی حضرت اورنگ زیب عالمگیر رحمتہ اللہ علیہ کے مُقابلے میں وہ ووٹ داراشکوہ کو دیتے حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ وہ بڑا بد عقیدہ آدمی تھا۔ ہمارے ممدوح کے مُقابلے میں جو متدین ایثار پیشہ، درویش اور اپنے بھائیوں پر جان چھڑکنے والے تھے، اس میں کوئی خاص خوبی نہ تھی بلکہ ایک بڑا عیب ہی تھا کہ کتابیں لکھتا تھا۔ اکبرِ اعظم تو الیکشن کا فارم بھی خود پُر نہ کر سکتے تھے۔ ان کے نامزدگی کے کاغذات ابوالفضل کو پُر کرنے پڑتے۔ بادشاہ بس نشانِ انگشت چُپ ثبت کرتا۔ محمود غزنوی اور احمد شاہ ابدالی سے بھی ہم یہ توقّع نہیں کرتے کہ وہ اِس کھڑاک سے گُزرتے۔ امیر تیمور کو ہم قائل کر لیتے۔ ہمارا خیال ہے کہ وہ ہماری بات ٹالتے لیکن یہ بھی گمان ہے کہ کُچھ اِس قسم کا عُذر کر کے کہ آج میری ٹانگ میں درد ہے کل الیکشن کی تاریخ کا اعلان کروں گا۔ راتوں رات گھوڑوں کی ننگی پیٹھ پر بیٹھ لشکر کو لے کر علی علی کرتے خوارزم کی طرف نکل جاتے۔ بلکہ اُن کا ایک آدھ گھوڑا جاتے جاتے ہماری پھوس کی کلی کو لات مار جاتا کہ اور دو مشورے صاحب قراں کو۔ اصولاً تو انگریزوں کو بھی

حکومت سنبھالنے سے پہلے ہندوستان میں الیکشن یا استصوابِ رائے وغیرہ کرانا چاہیے تھا لیکن خیر دوسرا طریقہ بھی حکومت بدلنے کا اتنا ہی مقبول اور مشہور ہے۔ بلکہ ہمارے ہاں جمہوریت تو مُدّت سے کافور ہے۔اِسی کا زیادہ دستور ہے۔

سوال یہ ہے کہ اِن دو گھِسے پِٹے طریقوں کے علاوہ بھی کوئی طریقہ ہے جو پُر امن بھی ہو۔افسوس کہ ٹیلی وژن اور ریڈیو کی بدعت رائج ہونے کے باعث لوگوں میں پرانے کلاسیکی ادب کا ذوق اُٹھ گیا ہے۔ ہائے کیا زمانہ تھا کہ لوگ شب و روز داستانیں کہتے سُننے رہتے تھے۔ خوش جمال بادشاہوں اور ماہ پارہ شہزادیوں کی اور تین آنکھوں والے نابکار دیوؤں کی اور اُڑتے قالینوں کی داستانوں میں اِس انہماک کا ایک ضمنی فائدہ یہ تھا کہ مُلک میں انفلیشن بھی پیدا نہ ہونے پاتی تھی۔ اِن قصّوں کہانیوں کے بموجب ایک بادشاہ کے لاولد مرنے پر لوگ صُبح دم شہر کے دروازے میں سب سے پہلے داخل ہونے والے مسافر کے سر تاج رکھ کر شادیانے بجادیتے تھے۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ شاہ مرحوم کا کانا وزیر اِس پہلے آدمی کو پہلے ہی بغلی دروازے سے یا فصیل کے بُرج سے رسّی لٹکا کر شہر کے دروازے کے پاس اُتار دیتا تھا اور وہ تڑکے تک سردی سے ٹھِٹھرتا اپنے کو بادشاہی کے خوابوں سے گرماتا وہاں دُبکا پڑا رہتا تھا۔ لیکن ہم اِسے محض بد گُمانی سمجھتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ اُس زمانے میں

ولی عہد پیدا کرنے کے معقول انتظام ہوتے تھے۔ خاصے گُنجان حرم، بیگموں کے بھی، کنیزوں کے بھی، امراو وزراء کی بہُو بیٹیاں اِس پر مستزاد اور اولادِ نرینہ کی بشارتیں اور دُعائیں دینے والے اہلِ اللہ بھی شہر کے باہر ڈیرے جمائے بیٹھے رہتے تھے۔ شہر سے باہر لیکن اتنی دُور بھی نہیں کہ لوگوں کو نذر نیاز کے ٹوکرے وہاں تک لے جانے میں دقّت ہو۔ علاوہ ازیں اِن دُعاؤں کو مستجاب بنانے اور اِس معاملہ میں قُدرتِ کامل کو ظہور میں لانے کے لیے محل کے اندر حبشی غُلام بھی رہتے تھے جِن کے سرکاری فرائض تو دِن میں ختم ہو جاتے تھے لیکن اپنے آقا کی بیگمات کی فرمائش پر اوور ٹائم بھی خُوشی خوشی کر لیتے تھے۔ خواجہ سراؤں کی موجودگی اِس میں مانع نہ ہوئی تھی۔ تاہم داستانوں سے پتہ چلتا ہے کہ بادشاہوں کی لاولدی اور صُبح دم مسافروں کو بیٹھے بٹھائے کی پکی پکائی بادشاہی ملنے کی وارداتیں خاصی ہوتی تھیں۔

ہم بادشاہت کے تہہ دِل سے قائل ہیں۔ اِس وقت بالخصوص مسلمان مُلکوں میں جو بادشاہ ہیں وہ ہماری آنکھ کا تارا ہیں۔ ہم نے کئی بار لکھا کہ اب جو ہمیں خُدا نے یہ مُلک دیا ہے تو اِس میں ہمیں بادشاہت لا کر کسی کو بادشاہ یا خلیفہ بنانا چاہیے تاکہ یہ آئین دستور، پیپلز پارٹی، بی این اے وغیرہ کے جھگڑے نہ اُٹھیں۔ یہ کوئی ضروری نہ تھا کہ ہمیں بادشاہ بنایا جاتا۔ کسی اور کو بھی بنایا جا سکتا تھا کیونکہ فی زمانہ اہمیت اور لیاقت

کو کون دیکھتا ہے تاہم ہماری شَنوائی نہ ہوئی۔ انگلستان ہم اِس لیے بھی آتے تھے کہ یہاں بادشاہت ہے۔ یہاں کبھی نہ کبھی تو کوئی لاولد مرے گا کیا۔ عجب یہاں صُبح دم دروازہ شہر میں داخل ہونے والوں کے حقوق تسلیم کئے جائیں۔ لیکن یہاں آکر پہلی مایوسی تو یہ ہوئی کہ اِس شہر میں فصیل ہے نہ کوئی دروازہ ہے جہاں ہم کمبل لے کر پڑ جاتے اور ہر روز اخبار ٹائمز خرید کر سیاہ حاشیے کی خبروں کا مطالعہ کرتے۔ ایک صورت یہ بھی تھی کہ لوگ دربدر تلاش کرتے تھے کہ شہر میں کوئی ایسا بصرے یا کاشغر کا نوجوان تاجر ملے جن کا تعلّق کسی بہانے شاہی خاندان سے ہو اور جو حسنِ سیرت اور حسنِ صورت، لیاقت اور فطانت میں یکتائے زمانہ ہو۔ ہم نے اِسی خیال سے اپنی ڈگریاں، اُس ڈگری کے علاوہ جو کوآپریٹڑ قرضہ کی نادہندگی کے سِلسِلے میں ہم پر ایک دیوانی عدالت نے دی تھی کوئی باہوش عدالت ایسا نہیں کر سکتی تھی، فریم کر کے اپنے ڈرائینگ روم میں لگادیں جہاں لوگ آتے جاتے رہتے ہیں۔ ایسے بھی جن کی پارلیمنٹ اور بکنگھم پلیس تک پہنچ ہے اور خود عملِ تسخیر شروع کر دیا۔ قباحت یہ ہوئی کہ کسی نے مَلِکہٴ عالیہ کو بروقت فیملی پلاننگ کا لٹریچر بھیجا تھا جس سے چند قباحتیں پہلے ہی پیدا ہو چکی تھیں بلکہ قباحت در قباحت بھی۔ اِس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ شہزادی این کے ہاں اِس عزیزہ کے پیدا ہونے کی ہمیں خُوشی نہیں جب

اور سبھی کو ہے تو ہمیں بھی ہے۔ تاہم یہ ہوا کہ بادشاہت کی کیو میں اُن کا نمبر لگ گیا۔ پانچواں۔ ع

ہم کہاں تک تِرے پہلو سے کھِسکتے جائیں

پھر بھی اگر پہلے چار اُمّیدواروں کو کُچھ ہو جائے اور اُن میں جو اولادِ نرینہ ہے وہ فاتر العقل نکل جائے یعنی سب کے سب امریکی منکوحہ عورتوں سے شادی کر کے وزیرِ اعظمِ وقت کو ناراض کر لیں یا رومن کیتھولک، مسلمان یا کبیر پنتھی ہو جائیں اور یہ نَو مولود بچّی تاج پہننے سے انکار کر دے کہ چُبھتا ہے یا میرا ہیئر ڈُو اِس سے خراب ہوتا ہے تو سلطنت دست بہ دست ہم تک آ سکتی ہے۔ لیکن آج یہ خبر آئی کہ اِس گھرانے میں ایک اور شہزادی نے جنم لیا ہے۔ یہ ڈچس آف گلوسٹر کی صاحبزادی ہیں۔ اِن کا بادشاہت کی قطار میں بارہواں نمبر ہے۔ ہم نے ایک ہمدرد سے ذکر کیا اور کہا کہ گلوسٹر پیلس میں رہنے کی وجہ سے ہم بھی ایک طرح کے ڈیوک آف گلوسٹر ہیں کہ نہیں۔ تو کہنے لگے صاحبِ من اگر مَلِکہ الزبتھ ثانی کو مَلِکہ وکٹوریہ کی عمر ارزانی ہوتی تو کُچھ عجب نہیں ایک سو بارہواں اُمّید وار بھی پیدا ہو جائے۔ پس سیدھے اپنے وطن واپس جاؤ۔ اپنا وقت مت ضائع کرو۔ امیگریشن کے رجسٹر کے مطابق تمہارا نمبر وراثت کے معاملے میں چھ کروڑ اٹھتّر لاکھ چوراسی ہزار آٹھ سو

پینتیسواں ہے۔ پھر تُم کالے بھی ہو اور پُرانی داستانوں میں بھی شاہی خُون کی شرط ہوا کرتی تھی۔

ہم نے بتایا کہ کالے تو ہم بیماری کی وجہ سے ہو گئے ہیں۔ جب وقت آئے گا تو اپنے مُلک سے گورا کرنے کی کریم منگالیں گے جس کے استعمال سے حبشی تک گورے ہو سکتے ہیں اور روڈیشیا اور جنوبی افریقہ تک کے مسئلے حل ہو سکتے ہیں۔ اب رہی شاہی خاندان کی بات، ہم نے ایک پُرانی کتاب میں دیکھا ہے کہ پراچین زمانے میں ہمارے جدِّ امجد کانجر کے قریب ایک ریاست کے ایک طرح سے راجا تھے۔ وہ یُوں کہ بظاہر راجا اِن کے چھوٹے بھائی تھے لیکن وہ بڑے بھائی یعنی ہمارے جدِّ امجد کا اتنا ادب کرتے تھے کہ اُن کی کھڑاؤں تخت پر تو نہیں، تخت پر جگہ ہی کہاں ہوتی ہے، تخت کے نیچے رکھتے تھے۔ ہمارے اِن مہربان نے فرمایا۔ یہ انگلستان ہے۔ یہاں انگریزی خُون یعنی سفید خُون کی شرط ہے۔ کانجر کا حوالہ نہیں چلے گا۔ ہم نے دِل برداشتہ ہو کر کہا۔ اچھا تو اور مُلکوں کے نام بتاؤ جہاں بادشاہت ہو اور جہاں جوہرِ قابل کی قدر ہوتی ہے۔ اسلامی مُلک ہو تو اور اچھّا ہے کیونکہ ہمیں اسلام کا بول بالا کرنے کا بھی شوق ہے۔ ہمارے اِن دوست نے چند مُلکوں کے نام بتائے لیکن یہ بھی کہا کہ آج کل وہاں ویزا کی پابندی ہے اور پاکستانیوں کو تو بالکل نہیں ملتا۔ اِس کے بعد

جیب سے پی آئی اے کا ٹائم ٹیبل نکال کر کہنے لگے بتاؤں لندن سے کون کون سی فلائیٹیں سیدھی کراچی جاتی ہیں؟ ہم نے منغّض ہو کر کہا۔ رہنے دو۔ ہم خود دیکھ لیں گے۔ آدمی کے گُڑ نہ دے گُڑ کی سی بات تو کرے۔

ہم بادشاہ ہو جاتے تو کیا کرتے۔ اِس باب میں ہم نے ایک منشور چھاپ رکھا ہے جسے خرچہ ڈاک کے لیے دس روپے بھیج کر ہم سے طلب کیا جا سکتا ہے۔ مختصر یہ کہ مُلک سے ساری بُری بُری باتوں کا قلع قمع کرتے۔ پہلے قلع بھر قمع۔ جمعہ کی چھُٹّی کرتے لیکن افسوس وہ پہلے ہی ہونے لگی ہے۔ خیر جمعے کی دو چھُٹّیاں کر دیں گے۔ ہمارے عہدِ معدلت میں ہفتے میں دو جمعے ہوا کریں گے تا کہ لوگ دِلجمعی سے عبادت کرتے رہیں۔ جمہوریت اور سوشلزم وغیرہ کے شیطانی وسوسے اُن کے دِل میں پیدا نہ ہوں۔ شراب کی ممانعت کرنے کا نکتہ بھی ہمارے منشور میں تھا، وہ بھی ہو چُکی لیکن ہرج نہیں۔ ہم مزید ممانعت کر دیں گے تا کہ جو لوگ نہیں پیتے وہ مزید نہ پئیں۔ یہاں تفصیل کیا دیں۔ آزمائش شرط ہے۔ مشک آنست کہ خود ببوید۔

تاریخ انگلستان ہم نے اِس خیال سے لکھنی شروع کی تھی کہ آخر میں اپنے عہد کا حال اپنے قلم سے لکھ جائیں تا کہ آنے والے مؤرّخ غَلَطیاں نہ کریں۔ لیکن قارئینِ کرام شاعر کہہ گیا ہے۔ جب وطن از ملک سلیمان خوشتر۔ اب ہم فرنگستان کے راج

پاٹ پر لات مار کر وطن واپس آنے اور ایک رحم دِل اور بیدار مغز تاجدار کے طور پر اپنے مُلک اور رعایا کی خدمت کرنے کے لیے بے تاب ہیں۔ جُونہی امراء اور عمائد کا کوئی وفد ہمیں لینے کے لیے آئے گا ہم لندن کے در و دیوار پر حسرت سے نظر کرتے ہوئے روانہ ہو جائیں گے۔اِس کالم کا کٹنگ سنبھال کر رکھیں۔اپنے سب قارئین کو ہم خِلعت و انعام دیں گے اور لوگوں کا مُنہ موتیوں سے بھر دیں گے۔ خصوصاًاُن کا جو نکتہ چینی کے لیے مُنہ کھولنے کی کوشش کریں گے۔

ختم شد